# آنند نرائن ملّا
# حیات اور شاعری

**مقالہ برائے پی ایچ. ڈی**

پیش کردہ

## وَمالیہ خاتون

ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو
ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اودھ یونیورسٹی، فیض آباد (یو. پی)


**نگراں**

ڈاکٹر محمد نسیم خاں
صدر شعبۂ اردو
بابا بروداس پوسٹ گریجویٹ کالج
پروئیا آشرم، ضلع امبیڈکر نگر


۲۰۰۹ء

# AANAND NARAYAN MULLA
# HAYAT AUR SHAIRY

Thesis

SUBMITTED TO

DR. RAM MANOHAR LOHIA AVADH UNIVERSITY

FAIZABAD

FOR THE DEGREE OF

**Doctor of Philosophy**

IN

**URDU**

BY

**WAMALIA KHATOON**

Under Supervision of

**Dr. Mohd. Naseem Khan**

Head

DEPARTMENT OF URDU

B.B.D.P.G. COLLEGE PARUIYA ASHRAM,

DISTT. AMBEDKAR NAGAR

**2009**
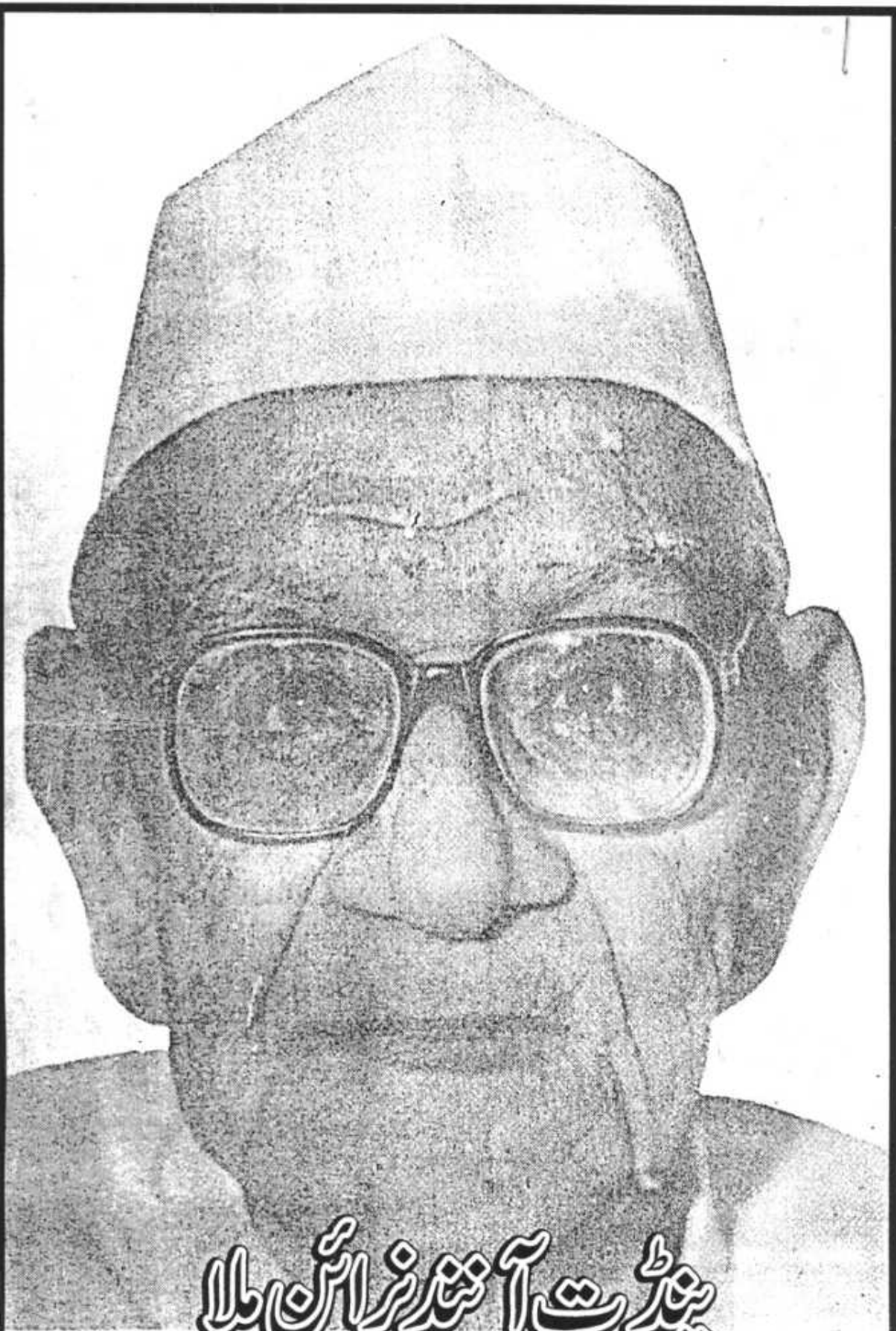
تاریخ پیدائش
۱۹۰۱ء

تاریخ وفات
۱۹۹۷ء

شعر ملّا ہے اندھیرے میں اجالے کی تلاش
فکر ملّا ہے ستارے توڑ کر لانے کا نام

# فہرست ابواب

# پیش لفظ

زبان کسی کی میراث نہیں ہوتی اور نہ یہ کسی فرد کے ساتھ مختص کر کے اس کو دھرم یا سماج جیسے طبقات میں منقسم کیا جا سکتا۔ ہندوستان میں خاص کر اردو کے ساتھ یہ حادثہ ہوا کہ اسے صرف ایک مذہب مخصوص کی زبان قرار دے کر نہ صرف اپنی کوتاہ بینی کا ثبوت فراہم کیا گیا۔ بلکہ اس کو عدم توجہی کا بھی شکار بنا کر اسے معزول کر کے اس کی بہن ہندی کی بات سوچی جانے لگی کسی کو مٹا کر دوسرے کو ترقی نہیں دی جا سکتی اگر اردو کے بنیاد گذاروں میں ملا وجہی، قلی قطب شاہ، میر تقی میر، محمد رفیع سودا، حکیم مومن خاں، مرزا غالب ، آتش و ناسخ انیس و دبیر کے نام لئے جا سکتے ہیں اور ان کے کارنامے بیان کئے جا سکتے ہیں تو اس کے دوش بدوش درگا سہائے سرور، برج نرائن چکبست، رام نرائن لال موزوں، چھنو لال دلگیر، رتن ناتھ سرشار، پریم چند، تلک چند محروم، شیام لال کالرا، گوپی چند نارنگ، حکم چند نیر، دلورام کوثری، گوپی ناتھ امن، برج موہن دتا تریہ کیفی، دیا شنکر نسیم، جگن ناتھ آزاد، گیان چین جین، ملک راج آنند، فراق گورکھپوری، جگت موہن لال رواں، پنڈت آنند نرائن ملا وغیرہ ایسے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کو کسی پیمانے پر بھی اردو کے اہم ستون ماننے سے منکر نہیں ہوا جا سکتا۔

پنڈت آنند نرائن ملا کو اردو ادب میں جو مقام ملا ہے اور علمی پیمانے پر جن کی واضح شناخت قائم ہے، ان سے کون واقف نہیں کہ وہ ایک صاحب طرز شاعر اور لائق قدر نثر نگار تھے، اردو سے ان کی والہانہ عشق کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ یہ ہے کہ انہوں نے بانگ دہل یہ اعلان کر دیا کہ ''میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن اپنی مادری زبان اردو کو نہیں چھوڑ سکتا'' اور یہ انہوں نے اس طرح ثابت کر دیا کہ اپنی پوری زندگی

اردو شعر و ادب کی خدمت اور اس کی ترقی و بہبود کیلئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ان کی اس حق گوئی اور بیبا کی کو انصاف پسندوں نے تسلیم بھی کیا ناقدین نے ملا کے فن کو تولا پرکھا اور داد و تحسین سے بھی نوازا۔ ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا اعتراف بھی کیا۔ لیکن ان کے شعری اور ادبی کارناموں پر کما حقہ کھل کر نگاہ نہیں ڈالی گئی، جس کے وہ مستحق تھے، ملا کے شعر و ادب میں جو پاک مزاجی اور شریف النفسی ہے، اس کے تجزیہ کے لئے ہنوز صحیفہ درکار ہے چند متفرق مضامین، جلسے، سمینار وغیرہ سے ان کے ادبی کارناموں کا حق نہیں ادا ہو سکتا تحقیق کی راہیں مسدود ہوتی ہیں۔ اسی فکر و احساس سے راقمہ نے آنند نرائن ملا حیات اور شاعری کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا کر ان کا بے لاگ، تحقیقی بنیادوں پر اپنی تحقیق کو استوار کرنے نیز ان کے فکر و فن کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اس عظیم مقصد کیلئے میں نے اپنے مقالہ کو سات ابواب میں منقسم کیا ہے۔

باب اول میں ملا کی حکایت ہستی ابتدائی دور یعنی مکتبی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم تک اور ججی کی خدمات کی انجام دہی کے دوش بدوش ان کی ادبی، سیاسی، قانونی خدمات کے ساتھ ان کی شخصیت کی عظمتوں پر سیر حاصل تحقیقی روشنی ڈالنے کی فکر کی گئی ہے۔

باب دوم میں ان کے عہد کا تہذیبی، سماجی، سیاسی اور ادبی جائزہ ہے۔ اس ضمن میں لکھنوی تہذیب، مختلف سیاسی اور ادبی تحریکات ہندوستان چھوڑ و تحریک، آزاد اور تقسیم کے واقعات اور لکھنوی شاعری کے رجحانات وغیرہ کے تفصیلی جائزہ کے ساتھ یہ واضح کرنے کی بھی کوشش شامل حال رہی ہے کہ ملا اپنے عہد کی سرگرمیوں ادبی سیاسی وغیرہ سے کتنا متاثر ہوئے، جس سے ان کی تشکیل فکر و فن ہوئی۔

باب سوم ملا کی غزل گوئی سے متعلق ہے، اس کے تحت لکھنوی غزل کا رنگ و آہنگ، ملا کی غزلوں میں ترقی پسند رجحانات اور ان کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور بحیثیت غزل گو کے ان کی حیثیت متعین کی گئی ہے۔

باب چہارم میں ملا کی نظم کا بھرپور تنقید جائزہ ہے موضوع کے اعتبار سے رومانی نظمیں، شخصی نظمیں، سیاسی اور قومی نظمیں ان سب کے ساتھ شخصی مرثیوں کا تجزیہ کیا گیا ہے اور بحیثیت نظم نگار کے ان کے درجے کو سمجھنے کی فکر کی گئی ہے۔

باب پنجم میں دیگر اصناف شعر کے تحت ملا کے قطعات و رباعیات، ثلاثی اور مثلث کا تفصیلی تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کے فنی اوصاف اجاگر کر کے ان کے متفرق کلام کا معیار متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب ششم میں ملا کی شاعری کے بارے میں مشاہیر ادب کی آراء کے اقتباس درج کر کے ان کا مرتبہ و مقام اس خیال سے کہ زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو ان تمام تر گرانقدر آراء کے آئینہ میں ملا کا مقام سمجھایا گیا ہے۔

باب ہفتم اس مقالہ کا حرف آخر ہے، جس میں یکجائی طور سے لیکن مختصراً ملا کی حیات رجحانات شخصیت غزل نظم رباعی قصیدہ اور نثری کارناموں کا ذکر کر کے ملا کی مجموعی ادبی حیثیت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتابیات کے ضمن میں ان کتابوں یا رسالوں کے نام درج کئے گئے ہیں، جن سے اس مقالے کی تیاری کے سلسلے میں کسب فیض کیا گیا اور ان کے براہ راست اقتباسات اس مقالے میں درج ہیں، انہیں کو فہرست میں جگہ دی گئی ہے ایسی بہت سی کتابیں ماخذات رسالے وغیرہ جن سے استفادہ تو کیا گیا لیکن ان کے اقتباسات شامل مقالہ نہیں ہیں، انہیں درج فہرست نہیں کیا گیا ہے۔

میں اپنے استاد محترم ڈاکٹر محمد نسیم خاں صاحب صدر شعبہ اردو کی تہہ دل سے شکرگزار ہوں، جنہوں نے اس مقالے کو منزل تکمیل تک پہونچانے میں ہمیشہ نہایت مخلصانہ او رمشفقانہ توجہ فرمائی اور ہر موج حوادث سے ہنستے کھیلتے گذر جانے کا برابر حوصلہ عطا کرتے رہے۔ ورنہ بغیر موصوف کی اس درجہ توجہ اور کرم فرمائیوں کے میری جیسے پردہ نشین کے منزل پالینا بے حد مشکل بلکہ ایک حد ناممکن الحل مرحلہ تھا۔

جناب باقر مہدی لیکچرر شعبہ اردو کی میں رہین منت ہوں، جنہوں نے میری حوصلہ افزائیوں کے سلسلے میں کتب اور ماخذات فراہم کرنے میں ہمیشہ مدد کی اور اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازتے رہے، جس سے میرے لئے کام آسان ہوتا چلا گیا۔ میں ان کی صمیم قلب سے ممنون کرم ہوں۔

ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی صاحب نے مجھے ہمیشہ مفید مشوروں سے نوازا اور کتب ورسائل اور دوسرے ماخذات مجھے فراہم کرائے میں ان کی سپاس گزار ہوں۔ راقمہ کی اولین بلکہ بنیادی فکر ہمیشہ یہ رہی کہ مقالے کو تحقیق وتنقید کی ذمہ داریوں اور ضوابط کی روشنی میں ہی اسے پایہ تکمیل کو پہونچانے کی کوشش کروں۔ میں اپنی فکر وکوشش، تلاش وجستجو اور ترتیب مقالہ کے سلسلے میں کس قدر کامیاب ہوسکی اس کا فیصلہ ارباب دانش ہی کرسکتے ہیں۔

وَمالیہ خاتون

ریسرچ اسکالر شعبہ اردو

بی. بی. ڈی. پی. جی. کالج پروئیا آشرم

# باب اول

# سوانح حیات اور شخصیت

پنڈت آنندنرائن ملا کے آباء واجداد کشمیرالنسل ہیں۔ کشمیر میں جو برہمن مسلمانوں کے دور اقتدار میں درس وتدریس کے پیشہ سے منسلک ہوتے تھے وہ ملایا آخون کہے جاتے تھے(۱) یہی ان کے خاندان کی وجہ تسمیہ ہے۔

پنڈت آنندنرائن ملا کے جد امجد (پردادا) پنڈت سیتارام کشمیر سے ہجرت کر کے کلکتہ میں آ کر بس گئے تھے، لیکن ان کے بیٹے پنڈت کالی سہائے ملا کب اور کن وجوہات کی بنا پر کلکتہ سے لکھنؤ آ کر رہنے لگے اس کی تفصیلات نہیں ملتی ہیں۔ صرف پنڈت آنندنرائن ملا کے قول کے مطابق ان کی تعلیم وتربیت لکھنؤ میں ہوئی اسی وقت سے ان کا خاندان مستقل طور سے لکھنؤ میں فروکش ہے ان کے دو بیٹے تھے بڑے بیٹے کا نام پنڈت کشن نرائن ملا تھا اور ان سے چھوٹے پنڈت جگت نرائن ملا تھے، جو پنڈت آنندنرائن ملا کے پدر گرامی تھے (شجرہ نسب ابتدا ہی میں بیک نظر استفادہ کی خاطر درج کیا جا چکا ہے)

آنندنرائن ملا کے والد پنڈت جگت نرائن کا شمار لکھنؤ کے رئیسوں اور عمائدین میں ہوتا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور وکیل تھے، ان کی بڑی سی کوٹھی کسی زمانے میں محلّہ رانی کٹرہ لکھنؤ میں تھی۔ وہ ماہر قانون ہونے کے علاوہ لکھنؤ بار ایسوسی ایشن کے چیئرمین بھی تھے۔ لکھنؤ میں کشمیریوں کا ایک محلّہ کشمیری محلّہ کے نام سے آج بھی موسوم ہے یہ محلّہ غلام حسین کے پل اور محلّہ منصور کے بیچ میں ہے یہاں ایک انٹر کالج بھی ہے، جو کشمیری محلّہ انٹر کالج کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہاں کے قریب قریب سب ہی کشمیر خاندان خوش الحال

---

(۱) تاریخ اقوام کشمیر ص ۱۶۶ محمد دین فوق گلشن پبلشرز گاؤ کدل چوک سری نگر کشمیر ۱۹۸۸ء۔

اور فارغ البال تھے۔ اکثر ان کے بزرگ نوابین اودھ کے درباروں سے منسلک تھے، اچھے عہدوں پر فائز ہونے کی بنا پر ان کی بڑی عزت بھی تھی۔ ساتھ ہی لکھنوی رہائش نے ان میں لکھنوی تہذیب، شائستگی، اخلاق و مروت، رکھ رکھاؤ، انسانت اور اخوت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ پنڈت آنندنرائن ملا کے والد لکھنوی تہذیب کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھے۔

عجیب اتفاق ہے کہ باوجود عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے کے آنندنرائن ملا اور ان کے والد جگت نرائن نے کبھی کوئی اپنا ذاتی مکان نہیں بنوایا۔ کرایہ کے مکان میں رہائش کو ہمیشہ ترجیح دی شروع میں پنڈت جگت نرائن ملا کلکتہ سے آکر لکھنؤ کے محلّہ رانی کٹرہ میں رہے کچھ دن بعد شاہ مینا صاحب کی مزار کے پاس نواب غلام حسین خاں کی کوٹھ میں چار سال گزارے پھر گولہ گنج چلے گئے اور پھر چائنا بازار گیٹ میں کافی بڑی مدت تک رہے۔ وہاں کی سڑک جو کبھی سرکلر روڈ کے نام سے موسوم تھی بعد میں پنڈت جگت نرائن روڈ کے نام سے مشہور ہوئی اب بھی جگت نرائن روڈ کہی جاتی ہے۔

اسی طرح پنڈت آنندنرائن ملا جب لکھنؤ سے دہلی آکر فروکش ہوئے تو پھر وہی کرایہ کے مکان کا شوق پہلے ۲۹-فیروز شاہ کوٹلہ نئی دہلی میں رہے پھر یہاں سے ۲۳-بلونت رائے مہتہ کستوربا گاندھی روڈ نئی دہلی کے سرکاری کوارٹر میں زندگی گزاری۔ آئے دن یہاں لکھنؤ کے شرفاء اور نوابین بغرض ملاقات آیا کرتے تھے، جن کے مزاج و گفتگو، عادات وخصائل سے لکھنوی نفاست کی شان ظاہر ہوتی تھی۔ یہی فضائل اور خوبیاں پنڈت جگت نرائن ملا میں بھی موجود تھیں۔ یہ اپنے محلّہ کے بزرگ اور شرفاء میں شمار ہوتے تھے اور ان کا گھرانہ لکھنؤ میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ پنڈت جگت نرائن ملا کو شعر گوئی سے کوئی لگاؤ تھا یا نہیں اس کی کوئی واضح شہادت نہیں ہے برخلاف اس کے کہ پنڈت آنندنرائن ملا نے اس بات کی تردید بھی ان لفظوں میں کی ہے:

''میرے علم میں تو میرے خاندان میں کوئی ایسا نہیں گزرا جس نے کبھی ایک مصرعہ بھی موزوں کیا ہو، یا اس نے نثر میں ہی کچھ لکھا ہو۔''(۱)

(۱) فروغ اردو لکھنؤ فروری ۱۹۷۴ء ص ۶۳۵ مضمون پنڈت آنندنرائن ملا سے ایک انٹرویو پروفیسر احتشام حسین رضوی۔

پنڈت آنند نرائن ملا کا گھرانا خوش حال اور کھاتا پیتا گھرانا تھا پنڈت جگت نرائن ملا پر قدرت کا یہ احسان خاص تھا کہ ان کو کبھی معاشی تنگی کا سامنا نہیں ہوا بلکہ نہایت معزز گھرانے کے فرد تھے، انہوں نے شعر کہے ہوں یا نہیں لیکن لکھنوی فضاؤں نے ان کے انداز سخن فہمی کی صلاحیت ضرور پیدا کر دی تھی۔

# ولادت۔طفولیت اور تعلیم وتربیت

پنڈت آنند نرائن ملا اپنے آبائی مکان واقع محلہ رانی کٹرہ لکھنؤ میں ۲۴ر اکتوبر ۱۹۰۱ء کو پیدا ہوئے، نہایت فارغ البال اور ہر اعتبار سے آسودہ اور مرفہ حال گھرانا تھا اس لئے ان کا ابتدائی زمانہ نہایت شاندار اور خوش خرمی میں گزرا۔

دستور زمانہ کے مطابق ان کی ابتدائی تعلیم کا آغاز اردو و فارسی سے ہوا، جو انہوں نے اپنے استاد مولانا برکت اللہ صاحب رضا فرنگی محلی سے باقاعدہ طور پر پڑھی، مولانا کی شخصیت اور علمیت کی شہرت محتاج تعارف نہیں ہے مولانا کو شعر گوئی کا بھی شغف تھا اس سلسلے میں عبدالشکور لکھتے ہیں:

''مولانا مرحوم ایک پرگو شاعر تھے، عجب نہیں کہ ان کی فیض صحبت سے مسٹر ملا نے شعر و شاعری کے ابتدائی اسباق حاصل کئے ہوں۔''(۱)

عبدالشکور صاحب کے یہ کلمات کچھ تذبذب لئے ہوئے ہیں اس سلسلے میں ملا کے الفاظ نہایت واضح اور مفصل ہیں، جن سے مفید نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے، ملاحظہ کیجئے:

''طالب علمی کے زمانے میں گھر پر اردو فارسی مولانا برکت اللہ صاحب فرنگی محلی سے پڑھتا تھا اور وہ اکثر سبق دے کر غزل کہنے میں مصروف ہو جاتے تھے اور ہر طرح پر کم سے کم پچاس ساٹھ اشعار کہتے تھے۔ جب میں کالج کا طالب علم تھا دو تین بار انہوں نے اپنے کہئے ہوئے اشعار پڑھنے کیلئے دیئے لیکن میں نے پڑھنا گوارا نہ کیا۔ مولانا بھی ناراض ہوئے اور یہ بھی بتایا کہ شروع شروع میں سب ہی کرتے ہیں لیکن مجھے

---

(۱) دور جدید کے چند منتخب شعراء ص ۱۳۵ عبدالشکور ایم۔اے۔ دانش محل لکھنؤ ۱۹۴۳ء۔

پھر بھی قبول نہ ہوا غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے وہ شعر پسند نہ آتے تھے۔ مولانا نے میری طرف سے ایک قطعہ تاریخ کہہ کر اپنے کسی شاگرد کے دیوان کے ساتھ جو ایک راجہ تھے، چھپوا بھی دیا ان کا نام شاید اشفاق حسین تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ میرا تخلص بھی اثر رکھ دیا گیا ہے۔ جب میں نے مولانا سے شکایت کی تب انہوں نے ناراض ہو کر فرمایا نہ آئندہ مجھے کوئی عطیہ دیں گے اور اگر میں کہوں گا بھی تو میرے اشعار کی اصلاح نہ فرمائیں گے۔''(۱)



پنڈت آنند نرائن ملا نے ابتدائی تعلیم کا آغاز رواج زمانہ اور خصوصاً دستور خاندان کے مطابق اردو فارسی کی تعلیم سے کیا۔ مولوی برکت اللہ صاحب ان کو پڑھانے کیلئے گھر پر ہی آیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کی ملا کے گھر کے سبھی لوگ عزت کرتے تھے۔ پنڈت آنند نرائن ملا نے اپنے استاد مولانا برکت اللہ کا ہر لمحہ احترام برقرار رکھا، جیسا کہ انہوں نے خود اظہار کیا ہے:

''جیسا کہ میرے بچپن میں دستور تھا میں نے اردو فارسی گھر پر پڑھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے مولانا برکت اللہ صاحب فرنگی محلی مرحوم کا سا معلم ملا تھا۔''(۲)

ابتدائی تعلیم کے بعد آئندہ تعلیم کیلئے ملا گورنمنٹ جبلی ہائی اسکول میں جو کہ اب انٹرمیڈیٹ کالج ہے، داخل ہوئے یہاں سے انہوں نے ۱۹۱۷ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اس کے بعد کیننگ کالج لکھنؤ سے ۱۹۱۹ء میں انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۲۱ء میں بی۔اے۔ ۱۹۲۳ء میں انگریزی ادب میں ایم۔اے۔ تک تعلیم حاصل کی۔ اسی سال کیننگ کلج لکھنؤ کو یونیورسٹی کا درجہ بھی دیا گیا تھا چنانچہ ۱۹۲۵ء میں انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی (دو سال پہلے کا کیننگ کالج) سے ایل۔ایل۔ بی۔ کی سند حاصل کی اور اسی سال لکھنؤ میں ہی اپنی وکالت (پریکٹس) کا آغاز کیا۔ اپنی طباعی ذہانت معاملہ شناسی اور حسن شعار کی بدولت ان کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکیلوں میں ہونے لگا تھا۔ دوران تعلیم (جب یہ ایم۔اے۔ کے طالب علم تھے) ۱۹۲۳ء میں ملا ICS کے امتحان میں شامل ہوئے لیکن اردو میں کم نمبر لانے کی وجہ سے فیل ہو گئے اس ناکامی کے وجوہات پر ملا

(۱) نگار جنوری-فروری ۱۹۴۱ء آنند نرائن ملا کی زبانی۔

(۲) پنڈت آنند نرائن ملا سے ایک انٹرویو، سید احتشام حسین فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۷۴ء۔

نے خود صاف صاف لکھا ہے:

''۱۹۲۳ء میں میں نے ICS کا امتحان دیا اور صرف اردو میں کم نمبر پانے کی وجہ سے ناکامیاب رہا میرا خیال ہے کہ چونکہ ایک سوال کے جواب میں میں نے میر کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم نہیں کیا اس لئے ممتحن نے یہ رائے قائم کی کہ یہ اردو ادب سے بالکل بیگانہ ہے اور اسے اردو میں اچھے نمبر نہیں دیئے جا سکتے۔'' (۱)

ملا کی شعری اور نثری تخلیقات کے اسلوب و انداز، تخیل الفاظ کا دروبست دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یقیناً اول درجہ کی تخلیقی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے لیکن گھر کے ماحول نے انہیں وکیل بنا دیا۔ ان کے والد بھی اسی پیشہ سے وابستہ تھے۔

ملا شروع ہی سے نہایت متوازن اور ہموار ذہن وطبیعت رکھتے تھے۔ ان میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ نظم وضبط سوچنے اور سمجھنے کا انداز انفرادی تھا اس بارے میں وہ کہتے ہیں:

''میں ان خوش قسمت یا بد قسمت لوگوں میں ہوں، جو اگر داڑھی نہیں تو مونچھیں لیکر خود پیدا ہوتے ہیں میرا خیال ہے کہ میرے ذہن میں ایک توازن بچپنے میں بھی موجود تھا۔ میں نے کوئی بات جب تک وہ خود میرے ذہن کو قبول نہ ہوئی محض اس وجہ سے کہ کوئی بڑا آدمی وہ بات کہہ رہا ہے کبھی نہیں مانی، اس ذہنی افتاد نے مجھے خود ہر بات پر مختلف پہلوؤں سے سوچنا سکھایا، اور اب تو یہ عادت میرے مزاج کا جز و بن چکی ہے، اس عادت نے اکثر مجھے نقصان بھی پہونچایا ہے............ وکالت کا پیشہ بھی ذہن کو توازن بخشتا ہے۔ کوئی وکیل جب تک وہ جو کچھ اس کے خلاف کہا جا سکتا ہے اس پر غور نہیں کرتا کامیاب نہیں ہو سکتا، جبھی تو توازن کا دوسرا نام ہے میں تو سمجھتا ہوں کہ میرے لئے مناسب ہوگا اگر میں اپنا تخلص توازن رکھ لوں۔'' (۲)

ملا کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں فطری طور سے غور وخوض کا مادہ بہت تھا۔ طبیعت میں سنجیدگی تھی، انہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی شروع ہی میں وہ انگریزی ادب اور ہندوستان کے کلاسیکی ادب سے خاصا لگاؤ رکھتے تھے اور ان دونوں ادبیات کا وہ اچھا شعور بھی رکھتے تھے۔

---

(۱) پنڈت آنند نرائن ملا سے ایک انٹرویو، سید احتشام حسین فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۷۴ء۔

(۲) فروغ اردو فروری ۱۹۷۴ء پنڈت آنند نرائن ملا سے ایک انٹرویو احتشام حسین۔

ملا کا گھریلو ماحول ادبی نہیں تھا لیکن اپنے رکھ رکھاؤ رہن سہن کے لحاظ ............شرفا کی اعلیٰ تہذیبی قدریں موجود تہیں ۔ ملا والد ایک مشہور قانون داں تھے اس لئے لکھنؤ کے آس پاس ان کا آس پاس بھی مقدمات کے سلسلے میں ان کی برابر آمد ورفت بھی رہا کرتی تھی، جس سے ان کے روابط اور جان پہچان بھی بہت بڑھ گئی تھی، جہاں تک ملا کے مشاغل اور غیر تدریسی ذوق شوق کا تعلق ہے، ملا ایک اچھے ہاک ٹینس کرکٹ وغیرہ کے کھلاڑی تھے اور تاش کا ہر کھیل انہیں آتا تھا جسا کہ ان کا بیان ہے:

''مجھے باغبانی کا شوق ہے تاش بھی بہت زیادہ کھیلتا ہوں پانچ برس کی عمر سے تاش کھلنا شروع کردیا تھا کوئی کھیل ایسا نہیں جو میں نے نہ کھلا، گنجفہ، نفس، برج، کرکٹ، کناسنا، تاش کھلنے کیلئے کلب جاتا ہوں کبھی رات بھر تاش کھلنے میں گذر جاتی ہے مجھے تاش کے علاوہ ہاکی ٹینس، گرلٹ کھیلنے کا شوق بھی رہا ہے۔''(۱)

ملا کو ہندوستانی موسیقی سے بھی خاصا شغف ہے، جدید یا فلمی قسم کی نہیں بلکہ کلاسکی اور اس میں کچھ ان کو سوجھ بوجھ بھی ہے۔ لیکن پیشہ وکالت کی ذمہ داریوں اور مصروفیات نے انہیں اس میں وقت کا گزاری کی مہلت نہیں بخشی ان کے لہجہ میں مردانہ وقار اور بلند آہنگی ہے۔

# ملا کا حلیہ، طور طریقے اور خصائل

ملاؔ کا قد میانہ چھوٹا نہ بڑا بلکہ نہایت مناسب رنگ سفید ان کے کشمیر ہونے کا غماز اکہرا جسم اونچی ناک پیشانی کشادہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، جن میں ان کی ذہانت کی چمک، اور خوبصورت سا چشمہ، آواز بھاری لگتا تھا جیسے کچھ بھرائی بھرائی سی۔ گفتگو کے لحاظ سے ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرنے کے عادی تھی۔ اثنائے گفتگو بار بار گردن کو جنبش دینے کے عادی، خوش وضع سنجدہ اور مہذب اور پان سگریٹ کے عادی ہیں۔ کپڑے ہمیشہ کشمیریوں جیسے زیب تن کرتے مثلاً شیروانی پاجامہ سفید اور سفید ہی کرتا۔ کوٹ پتلون شاید انہوں نے کبھی نہیں پہنا، خوش خوراک تھے، مشہور ہے کہ پورے پورے کئی مرغے اکیلے کھا لیتے تھے، غذا مرغن پسند

---

(۱) ماہنامہ ''ہمار'' انٹرویو از خالد ہندی نئی دہلی صفحہ ۱۷۔

تھی، کشمیری برہمن گوشت خور ہوتے ہیں اس لئے ملا کی برہمن ہوکر گوشت خوری چنداں تعجب کی بات نہیں کشمیریوں کی اکثر مذہبی رسوم میں بھی گوشت کا اہتمام رہتا ہے شوکت تھانوی ملا کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے طرز خاص (یعنی مزاحیہ انداز) میں لکھتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ مجھ سے بہت خلوص سے ملتے ہیں، مگر یہ دیکھ کر دل بیٹھ جاتا ہے کہ یہ خصوصیت تنہا میرے ساتھ نہیں، بلکہ جس سے بھی ملتے ہیں خلوص ہی سے ملتے ہیں گویا خلوص عام ہوکر خلوص باقی نہیں رہا۔ عادت بن گیا ہے، پیشہ وکالت ہے، مشغلہ شاعری اور ذوق ہے برج سے، گویا دماغ میں بیک وقت تعزیرات ہند، مصرعہ طرح، ٹونوٹو پیس گڈ مڈ رہتے ہیں تعجب ہے کہ عدالت کو شعر کیوں نہیں سنا بیٹھتے، مشاعرے میں شمع اپنے سامنے رکھ کر نوہٹ کیوں نہیں کہہ دیتے اور تاش کی میز پر بیٹھ کر جرح کیوں نہیں شروع کردیتے۔ ........... کشمیری النسل ہیں حسین تو نہیں مگر دلکش ضرور ہیں انگریزی لباس کبھی نہیں پہنا، مگر ہندوستانی لباس میں بھی تعلیم یافتہ نظر آتے ہیں خالی اوقات میں گنگناتے رہتے ہیں اور اپنا کلام سنانے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔''(۱)

مزاج کے اعتبار سے ملاؔ نہات غیور، خوددار، اعتدال پسند اور متوازن ضبط وصبر، اصول پسندی، تنہائی کے رسیا، بلند ذہن حاضر دماغی، گفتگو میں سادگی اور ٹھہراؤ ان کی فطرت میں داخل تھا، اپنے وقت کے اچھے وکیلوں میں شمار ہوتا تھا معروف سیاست داں قانون داں اور ادبی حلقوں اور انجمنوں کی مقبول ترین شخصیت تھے، اخوت انسانی اور قومی یک جہتی کے علمبردار نام ونمود کی خواہش سے کوسوں دور اور علم وادب کی خدمت اپنا فرض سمجھتے تھے اردو زبان کے عاشق اور ایسے شیدائی کہ اپنے مذہب تک کو چھوڑنا انہیں گوارا تھا لیکن اردو زبان سے اپنا رشتہ نہیں چھوڑ سکتے تھے، برملا کہتے کہ میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن اردو زبان نہیں، اردو میری ماں ہے، نجی صحبتوں میں نہایت بے تکلف رہتے تھے۔

---

(۱) شش محل شوکت تھنوی ۲۲-۲۳ خواجہ برقی پریس دہلی پہلا ایڈیشن۔

# ملا کی منفرد شخصیت اور اس کے تشکیلی اجزاء

## شخصیت کا مفہوم:-

کسی بھی انسان کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل اس کے گردوپیش کے حالات، تہذیبی، تمدنی اقدار اس زمانے کے واقعات و حادثات اور اس کے اپنے نجی معاملات، اخلاقی قدروں کی پاسداری اور لحاظ، شرافت، سلیقہ، بزرگوں کا ادب واحترام، چھوٹوں پر برابری اور شفقت کا اظہار، اپنوں کے مابین میانہ روی، حق وانصاف کی تلاش، بلند اخلاق وکردار، پاکیزگی باطن، خلوص ومحبت، انسانی دردمندی، خودداراور بے نیازی جیسے اوصاف اور نسلی وخاندانی خصوصیات اور ماحول کے اثرات سے مل جل کر شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ ملا کے خون میں کشمیر کا حسن وہاں کے پھولوں کی مہک، آبشاروں کا ترنم اور کھنک، دریا کی روانی کے ساتھ پہاڑوں جیسی ثابت قدمی بھی ہے۔ وہ لکھنؤ کی آب وہوا میں پیدا ہوئے وہاں کی فضاؤں میں پروان چڑھے اس وجہ سے لکھنوی تہذیب اور وہاں کی تمدنی خصوصیات سے متاثر ہونا ان کیلئے ناگزیر تھا۔ ملا کے گھریلو حالات نہایت پرسکون واطمینان بخش تھے۔ ان کا بچپن تعلیم وتربیت، جوانی کا زمانہ انتہائی بے فکری اور خوش حالی میں گذرا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور آبائی پیشہ وکالت سے منسلک ہوگئے۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی:

''سیرت کا حسن دنیا کے تمام حسن سے افضل ہوتا ہے یہ بات جتنی سچی اور پکی ہے افسوس ہے کہ اتنی ہی دیر میں اور کبھی کبھی وقت نکل جانے پر اس کا احساس ویقین ہوتا ہے لیکن ملا کے یہاں سیرت کا یہ حسن ان کی شخصیت میں فطری اور روز ازل سے موجود تھا اس کا انہیں ہمیشہ احساس بھی رہا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جو بھی قدم اٹھایا۔ یا جو بھی بات یا فیصلہ کیا نہایت ٹھہر کر اور سوچ سمجھ کر بچپن میں وہ منفرد انداز فکر کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت بڑی اہمیت کی حامل ہے، ان کے اندر ایک مکمل انسان (आदर्श व्यक्ति) چھپا ہوا ہے۔ ان کی فطرت اور ذہن وقلب کسی شے پر ایمان (Blieve) نہیں رکھتا ہے صرف انسان پر

Blieve کرتا ہے۔ وہ ایسی انسان دوستی کے شائق تھے، جو آج کے لئے بھی ہے اور کل کیلئے بھی اور کل کے بعد یہی چیز ان کے خیال کے مطابق انسان دوستی اور انسانی ترقی میں معاون ہوتی ہے۔ اس تناظر میں ان کا یہ شعر دیکھئے، جس سے ان کی فکر کی پاکیزگی مترشح ہوتی ہے:

مجھے اے خالق کون ومکاں خاموش کر دینا
میرے لب پر نہ جس دن درد انساں کی پکار آئے

یہی وجہ ہے کہ ان کے فکر وفن دوسرے شاعروں اور ادیبوں سے یکسر الگ ہیں۔ وہ کسی نظام حیات یا نظریہ کے مقلد نہیں، ایک انسان ہونے کے ناتے انسانیت کے سچے اور بے غرض قسم کے ہمدرد ہیں، جس کا ثبوت ان کے یہ اشعار بخوبی پیش کرتے ہیں، جوان کے دل کی آواز بن کران کے ہونٹوں پرآتے ہیں:

اک بار دور گردوں ایسا نظام بھی ہو
جس میں ہر ایک میکش صہبا بہ جام بھی ہو
مظلوم کا کلیجہ تیر ستم نہ ڈھونڈھے
ایوان شادمانی بنیاد غم نہ ڈھونڈے
انسان غاصبانہ راہوں سے ہٹ چکا ہو
پیشانی بشر کا تیور پلٹ چکا ہو
انسانیت کا پودا ٹھٹھرے نہ جس ہوا میں
دل کا بھی سانس لینا ممکن ہو جس فضا میں

سماج اور انسانیت کے دکھ درد اور ان پر ڈھائے جانے والے مظالم سے بے چین ہو جانا ان کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ حق گوئی صلہ رحمی، ایسے اوصاف ہیں، جو ان کی سیرت وشخصیت کو بلند وارفع مقام عطا کرتے ہیں۔ ''نسلی اعتبار سے آنند نرائن ملا کشمیری النسل ہیں اور کشمیریوں کے بارے میں یہ عام خیال ہے کہ وہ نہایت ذہین اور وسیع النظر ہوتے ہیں۔ وہ لکھنؤ کی بارونق فضاؤں میں ایک خوشحال گھرانے میں پیدا

ہوئے تھے یہیں تعلیم وتربیت حاصل کی اور فارغ التحصیل ہوکر اپنے آبائی پیشہ میں لگ گئے تھے اور ججی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ دولت وعزت وشہرت نے ان کے قدم چومے انہوں نے ادب اور زندگی کو قریب سے دیکھا اور پرکھا، بقول ڈاکٹر اعجاز حسین:

''ان کی تعلیم مغربی انداز میں انگریزی میں ہوئی، انگریزی تعلیم نے کیٹس، شیلے، بائرن، ورڈس ورتھ اور شیکسپیئر سے نہ صرف روشناس کرایا بلکہ انہیں متاثر بھی کیا۔ ملا ایک طرف اقبال، انیس اور غالب سے متاثر ہوئے تو دوسری طرف ترقی پسند شعراء کے معاون بھی ثابت ہوئے اور بالواسطہ طور پر ان کے اثرات بھی قبول کئے لیکن خاص طور سے وہ کسی ازم یا نظریہ کے قائل نہیں تھے لکھنؤ میں رہتے ہوئے یہاں کے عام ادبی ماحول سے مماثلت نہیں ملتی۔ البتہ لکھنؤ کی تہذیب کے اثرات ان کی شخصیت اور مزاج میں ایک نکھرے اور ستھرے رنگ سے ملتے ہیں۔'' (۱)

ملا کے خصائل پر روشنی ڈالتے ہوئے خالد ہندی رقم طراز ہیں:

''ان کے عادات واطوار، وضع قطع اور ہیئت ہمارے شاعروں سے قطعی مختلف ہے، ان میں بوہمیزم (Bohamianism) نہیں ہے، جو شاعروں کا طرہ امتیاز ہے سمجھا جاتا ہے ان کی زندگی میں سلیقہ ہے ترتیب ہے نظم وضبط ہے ان میں لاابالی پن نہیں، قانون کے مطالعہ اور جج کی بلند کرسی نشینی کی وجہ سے ان میں وہ کمزوریاں اور خامیاں داخل نہیں ہو پائیں، جن کو عموماً شاعروں کی زندگی کا جزو لازم سمجھا جاتا ہے۔ ان کی زندگی ایک متوازن اور ہموار زندگی ہے ان کی شخصیت میں بہت سی خصوصیات کا حسین سنگم ہے۔ ایسا سنگم جہاں شعروشاعری کا چشمہ سماجی خدمات اور انسانی خلوص ومحبت کی رواں دواں ندی اور علم وفہم کا وسیع دریا بھی آکر مل گئے ہیں۔ ان کی زندگی میں جو اس قدر توازن وتربیت ہے اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ شعروشاعری ان کا شوق ہے انہوں نے اسے پیشہ نہیں بنایا۔'' (۲)

خالد ہندی اسی انٹرویو کے حوالے سے آگے لکھتے ہیں:

(۱) مختصر تاریخ ادب اردو ص ۲۰۹ ڈاکٹر سید اعجاز حسین سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۶۵ء۔
(۲) انٹرویو خالد ہندی ۱۴ جولائی ۱۹۶۹ء۔

''ان کی شخصیت اور فن دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ ان کا کلام پڑھ کر ان کی شخصیت کے بارے میں آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور خود ان کے قریب آ کر ان کے کلام کے بارے میں رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ ان کی فنکارانہ اور ذاتی زندگی دو الگ الگ خانوں میں منقسم نہیں ہے وہ دہری زندگی نہیں گزارتے ہیں ان کے قول و فعل میں اسی طرح مطابقت ہے، جس طرح ان کی ذات اور فن میں مطابقت ہے۔''(۱)

اکثر ادبی شخصیتوں کے اندر تضاد کی کیفیت ہوتی ہے، جیسے کہ وہ دہرے نقاب میں ملبوس ہوں لیکن ملا کی زندگی میں ایسا کوئی تضاد نہیں ہے، چنانچہ ملا صاحب کا خود کہنا ہے:

''میرے قول و فعل میں اور میری زندگی میں کبھی کوئی نمایاں تضاد رونما نہیں ہوا، مجھے زندگی نے جنون و خرد کے دوراہے پر لا کر کبھی کھڑا نہیں کیا بلکہ میرے جنوں کو خرد ہی نے پالا اور پروان چڑھایا۔ میری زندگی اور میری شاعری الگ الگ خانوں میں رکھنے والی چیز نہیں۔''(۲)

مذکورہ بالا ادیبوں اور خود ملا کے بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ملا کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ ادبی، سیاسی، سماجی تبدیلیاں ہوتی رہیں لیکن ملا ہمیشہ اپنی جگہ پر قائم رہے۔ ان کا کلام ان کی شخصیت اور افتادِ طبع کا آئینہ کہا جاسکتا ہے۔ ملا نے عمر بھر نہ کسی سے معرکہ آرائیاں کیں اور نہ ان سے کسی سے کبھی کوئی چشمک ہی رہی۔ انہوں نے اپنے معاصرین کو کبھی طنز و تنقید کا نشانہ نہیں بنایا۔ اسے ہم ان کی کشادہ نظری اور اعلیٰ ظرفی کہہ سکتے ہیں۔ ان کی شخصیت اور ان کے کلام میں کسی قسم کا تصنع دیکھنے کو نہیں ملتا ہے، وہ سراپا اخوت و محبت کے امین اور پجاری رہے۔

اس ضمن میں علی جواد زیدی کا یہ بیان دیکھئے، جو ملا کی شخصیت کے سلسلے میں نہایت مفید معلومات فراہم کرتا ہے:

''ملا کی ساری زندگی بڑی متانت اور سنجیدگی کی زندگی رہی ہے ان کی سوانح حیات کا عنوان سنبھلا

---

(۱-۲) انٹرویو خالد ہندی ہماد بلی جولائی ۱۹۶۹ء.......................

سنبھلا اور تھما تھما سا رہا ہے۔'' (۱)

ملا کی قوت حافظہ نہایت قوی اور تیز تھی ان کی یہ صفت ان کی نسلی وراثتی صفت تھی، جو عموماً کشمیری پنڈتوں میں ہوتی ہے جہاں تک شعر لکھنے کا اور یاد رکھنے کا تعلق ہے انہوں نے شعر موزوں کرتے وقت کبھی قلم و کاغذ کا سہارا نہیں لیا بلکہ سیلاب کی طرح جو آمد شروع ہوتی اشعار دل و دماغ پر نقش ہو جاتے۔ اس طرح پوری پوری غزلیں نظمیں بے محابا اس طرح یادداشت میں محفوظ ہو جاتیں، جیسے ٹیپ Tape کر لی گئی ہوں۔ اپنے حافظے کے بارے میں انہوں نے اکثر اشارتاً کہا ہے:

''میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں نہ جانے کتنی بار شروع سے آخر تک دیوان غالب پڑھا ہوگا۔ سارے کا سارا دیوان مجھے حفظ تھا اور مجھے حافظ غالب کا لقب آسانی سے دیا جا سکتا تھا۔'' (۲)

ایک محبِ وطن کی حیثیت سے ملا متعدد سیاسی شخصیات سے متاثر ہوئے ہیں، ان میں مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، اندرا گاندھی، سروجنی نائیڈو، رابندر ناتھ ٹیگور وغیرہ کے نام خاص طور سے لئے جا سکتے ہیں۔ خاص طریقے سے مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو سے انہیں بے حد عقیدت اور لگاؤ تھا۔ ان کے اس لگاؤ اور تاثر کی توثیق انہیں کی زبانی ملاحظہ کیجئے:

''پنڈت جواہر لال نہرو کی شخصیت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، میرا پہلا تصنیفی کام یہی تھا کہ میں نے نہرو کی تمام انگریزی تقریروں کا اردو میں ''مضامین نہرو'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ یہ ہیرو شپ یا شخصیت پرستی نہیں ہے بلکہ میری عقیدت کی ٹھوس بنیاد ہے۔'' (۳)

اس طرح پروفیسر احتشام صاحب سے ایک انٹرویو میں مہاتما گاندھی کے بارے میں (گاندھی جی کی شخصیت سے متاثر ہو کر) انہوں نے کہا ہے:

''جنگ آزادی سے کہیں زیادہ اثر مجھ پر مہاتما گاندھی کی شخصیت اور ان کی تحریک عدم تشدد کا ہوا۔

---

(۱) آپ سے ملئے ص ۶۱ علی جواد زیدی مرتبہ عرفان عباسی لکھنؤ۔

(۲) کچھ نثر میں بھی ص ۱۱۹ آنند نرائن ملا مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی ۱۹۷۵ء۔

(۳) ملا سے انٹرویو از خالد ہندی نئی دہلی جولائی ۱۹۶۹ء۔

پنڈت نہرو آج تک دل ودماغ پر بڑی حد تک چھائے ہوئے ہیں اس تحریک سے میں سمجھتا ہوں کہ خالی مجھ ہی کو نہیں بلکہ ساری دنیا کو متاثر کیا اور ارتقائے انسانی اور امن عالم کے لئے ایک نیا راستہ دکھایا۔ اگر میں عدم تشدد کا قائل نہ ہوتا تو آج ہی میں بھی اشتراکیت پر ایمان لے آتا۔"(۱)

# ملا کی حب الوطنی اور انسانی یک جہتی

حصول آزادی نے اہل ہند کو قومی پیمانے کی دو خوشیاں عطا کی ہیں ایک یوم آزادی ۱۵ راگست کا دن اور دوسرا ۲۶ رجنوری یوم جمہوریہ کا دن (اسی دن ہمارا ہندوستانی دستور نافذ ہوا تھا) ان دونوں مواقع پر اردو شعراء نے نظمیں کہیں اور اپنی خوشیوں کا اظہار کیا ہے۔ ان نظموں میں آزادی اور جمہوریت کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ ملا صاحب بھی شعراء کی اس صف میں شامل ہیں، جنھوں نے نظمیں یا غزلیں کہیں ہیں وہ خود کہتے ہیں:

"جنگ آزادی کا جو اثر مجھ پر پڑا وہ میرے کلام سے ظاہر ہے میں سمجھتا ہوں آپ میری نظموں میں اس جنگ آزادی کی تصویر دیکھ سکتے ہیں ممکن ہے یہ تصویر بہت روشن نہ ہو لیکن کچھ ایسی دھندلی بھی نہیں اس جنگ سے اس طرح متاثر ہوا، جس طرح اور لاکھوں کروڑوں ہندوستانی جنہیں اس دور میں پیدا ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔"(۲)

غالب کا ایک شعر ہے:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

اس شعر کا پہلا مصرعہ ملا کیلئے محض شاعرانہ خیال نہیں بلکہ ایک عقیدت کی حیثیت رکھتا ہے وہ انسان کو کل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں محض ایک جزو کی حیثیت سے نہیں، ملا انسان دوستی اور قومی یک جہتی اور امن

---

(۱-۲) ملا سے ایک انٹرویو احتشام حسین فروغ اردو لکھنؤ۔

عالم پر ایمان رکھتے ہیں۔

انگریزی شاعر ورڈس ورتھ (Wordsworth) نے کبھی کہا تھا: ''شاعری انسانی رشتوں کے اظہار کی بات ہے۔'' اور اسی شاعر نے یہ بھی کہا تھا: ''شاعری ملکی حدود سے خواہ وہ حدود زبان کی ہوں یا معاشرت کی ہوں، نکل کر سارے عالم اور ساری انسانیت کی شاعری بن جاتی ہے۔'' یہی جذبہ اور تصور ملا کے یہاں غم انسانیت، غم دوراں اور انسان دوستی کے ایک مشترکہ تصور کے طور پر جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ کسی نظریہ کے پابند یا ازم کے اسیر نہیں ہیں اور نہ ان پر زبردستی کوئی نظریہ لادا یا تھوپا جاسکتا ہے۔ بس ان کا ایک ہی بین الاقوامی نوع کا نظریہ مسلک انسانیت یا انسانی یک جہتی ہے۔ ملا کی نظموں میں انسانی اخوت اور عالم گیر برادری کا پرچار یا وکالت ہے اور اس کے ساتھ ذات فرقہ، رنگ و نسل، مذہب کا امتیاز ختم کرنے کی تلقین ہے۔ ملا کو انسانی زندگی کی اعلیٰ قدروں سے محبت ہے اس لئے ہر انسان سے انہیں پیار ہے، وہ ہر حال میں جمہوری مساوات کے قائل ہیں اور اسی نظریہ پر عمل پیرا ہیں ان کا ذہن ہر قسم کی عصبیت سے پاک اور منزہ ہے۔ ان کی شاعری عصر آگہی کا اچھا نمونہ ہے۔ ان کا زیادہ تر کلام جذبہ حب الوطنی اور وطن پروری کے جذبات سے معمور ہے۔ اپنے عہد (بیسویں صدی) میں اردو زبان و ادب کے عہد ساز و عہد آفریں شخصیت کی حیثیت سے ان کا کلام کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اردو کے جدید دور کے غزل گو شعراء فانی، حسرت، اصغر، جگر، صفی، آرزو، فراق کی صف میں ان کا شمار تو کیا جاسکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملا کی آواز ان شعراء سے مختلف ہے، کیونکہ انہوں نے انسانی عظمت کے اعتراف و تلقین کے پس منظر میں شاعری کی ہے اور یہ اردو میں ایک نئی تلاش کہی جاسکتی ہے۔

## شادی اور اولاد

عہد ملا کے ماحول کے مطابق ملا کی شادی ۹ رفروری ۱۹۲۳ کو محترمہ انپورنا کے ساتھ ہوگئی تھی حالانکہ ابھی ان کا تعلیمی سلسلہ برقرار تھا ملا کی ازدواجی زندگی نہایت پر عافیت اور پرسکون تھی۔ وہ خود بھی نہایت

شریف وکریم النفس وشریف الطبع واقع ہوئے تھے۔ نرم خوئی ان کا ہمیشہ شعار رہا ہے۔ اس لئے ان کی خانگی یا ازدواجی زندگی میں کسی قسم کی ناگواری بے اطمینانی یا تلخی کا شائبہ نہیں ملتا۔ ملا کے کوئی اولاد نرینہ نہیں ہوئی صرف ایک لڑکی چترا دسمبر ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئی تھی۔ بعد تعلیم اس کی شادی ملا نے سہارنپور کے ایک معزز گھرانے میں کردی تھی، جہاں اس نے خوشحال زندگی گزاری۔

# ملا کی شاعری کا آغاز

یہ عجیب قسم کا واقعہ ہے کہ ملا نے اپنی شاعری کا آغاز بجائے اردو کے انگریزی سے کیا تھا۔ شعر گوئی کا فطری جوہر ان کے اندر شروع ہی سے موجود تھا۔ لکھنوی فضاؤں نے اس میں اور رنگ آمیزی کردی۔ وہاں کی ادبی محفلیں اور مشاعروں کی انجمنیں ان کے اس ذوق کا ثبوت فراہم کرتی ہیں، جن میں ملا باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ ابھی وہ گورنمنٹ جبلی ہائی اسکول کے ہی طالب علم تھے کہ ان کو انگریزی شعروادب سے لگاؤ پیدا ہوگیا، جس کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں:

''کالج کے اندر انگریزی میں کچھ کچھ نظم کرنے کی عادت ہوگئی چنانچہ میر انیس کی چند رباعیوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا، جو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور کالج کی میگزین میں بھی طبع ہوا۔''

''۱۹۲۷ء میں صحت خراب ہوگئی ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ بستر پر لیٹا رہنا ہے پڑے پڑے دل گھبرایا کرتا تھا۔ اس لئے کتابیں دیکھا کرتا تھا اس زمانے میں علامہ اقبال کا ایک مجموعہ پیام مشرق میں طبع ہوا تھا۔ اس کی ایک نظم لالہ طور کا ترجمہ انگریزی میں لیٹے لیٹے کرڈالا جو حلقہ احباب میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔'' (۱)

اس قول کی مزید توثیق وتصدیق ملا نے خود ہی اپنی زبان میں مفصل طور پر کی ہے، ملاحظہ کیجئے:

''مجھ پر اپنی طالب علمی کے زمانے میں انگریزی ادب کا بہت گہرا اثر تھا۔ بائرن، کیٹس، شیلی سے

---

(۱) اوراق گل، مرتبہ ضمیر احمد ہاشمی ص ۳۲۲ ایچ آر. خاں رامپور اسٹیٹ ۱۹۴۴ء۔

بہت زیادہ متاثر تھا............ کالج تک پہونچنے سے پہلے ہی مجھے انگریزی افسانے پڑھنے کا بے انتہا شوق پیدا ہوگیا تھا اور ایک دن میں ایک ناول پڑھ لینا میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا اور میں یہ ناول درجہ میں بیٹھ کر بھی پڑھا کرتا تھا۔ شاید یہی وجہ ہو کہ میں نے انگریزی میں شاعری شروع کی۔ کوئی سات سال میں نے انگریزی میں شاعری کی اس دور میں میں نے اقبال، انیس اور غالب کے کچھ ترجمے بھی انگریزی میں نظم کئے، جن میں سے کچھ میرے پاس ابھی تک محفوظ ہیں میری اس زمانے کی انگریزی نظموں میں ایک نظم The Land of India میرے پہلے مجموعے ''جوئے شیر'' میں زمین وطن کے عنوان سے ہے وہ در اصل اس انگریزی نظم سے ماخوذ ہے۔ میری یہ انگریزی نظمیں بھی حلقہ احباب میں پسند کی گئیں۔'' (۱)

ملا کے اس بیان سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ انہوں نے محض سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں یعنی ہائی اسکول پاس کرتے ہی اردو کے نامور شعراء مثلاً میر انیس، اقبال، غالب وغیرہ کے اشعار کا انگریزی اشعار میں ترجمہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان تراجم میں علامہ اقبال کے پیام مشرق میں شامل ان کی مشہور رباعیات (لالہ طور) کا مکمل انگریزی ترجمہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی مقبولیت کو سراہتے ہوئے اقبال اکیڈمی پاکستان نے اسے شائع کیا اور اس کا نہایت پرمغز دیباچہ جگناتھ آزاد نے تحریر کیا تھا، غالب کے کلام کے کچھ حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کے سلسلے میں ملا کا بیان ہے:

''میں سترہ اٹھارہ سال کی عمر سے ہی انگریزی میں کچھ تک بندی کرر ہا تھا اس کچی عمر میں ایک انڈر گریجویٹ (Under Graduate) طالب علم کیلئے غالب کے کلام کے کچھ حصوں کا ترجمہ انگریزی میں کرنا جہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کم عمر نوجوان کا حوصلہ اس کی صلاحیت سے کہیں زیادہ تھا۔ وہاں اس انتہائی عقیدت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے، جو میرے دل میں غالب کے لئے تھی۔'' (۲)

---

(۱) پنڈت آنند نرائن ملا سے ایک انٹرویو پروفیسر احتشام حسین رضوی فروغ اردو جنوری-فروری ۱۹۷۴ء۔
(۲) کچھ نثر میں بھی ص ۱۱۹ پنڈت آنند نرائن ملا مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی ۱۹۷۵۔

# اردو شاعری کا آغاز

ملا کو اوائل عمری سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ ان کے گھر پر بھی سال میں دو ایک مشاعرے ضرور ہوا کرتے تھے اس کے علاوہ لکھنؤ کی دیگر ادبی انجمنیں اور مشاعرے بھی اس زمانے کی لکھنوی تہذیب کا ایک حصہ بن چکے تھے۔ قوی قیاس ہے کہ ماحول کی یہ ادبی اور شعری سرگرمیاں ملا پر ضرور اثر انداز ہوئی ہوں گی۔ انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے ملا کی انگریزی ادبیات پر بھی گہری نگاہ تھی۔ یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ انہوں نے انگریزی میں شاعری شروع کردی۔ ملا نے کینگ کالج (موجودہ لکھنؤ یونیورسٹی) میں تعلیم حاصل کی تھی اس زمانے میں شاعری کا چرچا اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ کالج ہوسٹلوں تک میں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اس وقت کے تمام اساتذہ فن مولانا رضا فرنگی محلی، یاس یگانہ چنگیزی، ثاقب لکھنوی جیسے باکمال حضرات تک ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ ان مشاعروں کا بھی ملا پر اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ لیکن ان کا غالب رجحان ابھی تک اردو شاعری کی طرف نہیں تھا، کبھی کبھی مولانا رضا صاحب اپنے اشعار پڑھنے کو ملا کو دیتے لیکن ملا کی خودداری نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ پرانے مال سے اپنی دکان سجائیں۔

پنڈت منوہر لال زتشی (۲) اردو کے بے لوث خادموں میں شمار کئے جاتے تھے۔ زتشی صاحب کے ہم عصروں میں پنڈت بشن نرائن، پنڈت برج موہن دتا تاریہ کیفی، تیج بہادر سپرو، پنڈت برج نرائن چکبست وغیرہ جیسے باکمال شعراء تھے، پنڈت زتشی صاحب کی علمیت اور ادبی صلاحیتوں کے سبھی معترف تھے اور یہ کہ یہ لکھنؤ کی تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہا کرتے تھے یہ پہلے الہ آباد ٹریننگ کالج بعد میں لکھنؤ کے جوبلی کالج کے پرنسپل ہو گئے تھے۔ پنڈت منوہر لال زتشی نے ملا کے اندر چھپے ہوئے شاعر کو پہچان لیا تھ۔ (اس زمانے میں ملا کی انگریزی شاعری کا شہرہ تھا) زتشی صاحب کی تحریک ترغیب اور مشورے سے

(۲) کشمیر کے وہ پنڈت جو علم سنسکرت اور خاص کر جیوتش کے ماہر ہوتے تھے انہیں زتشی کہا جاتا تھا۔

ملا نے بجائے انگریزی کے اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں خود ملا معترف ہیں کہ:

''۱۹۲۲ء میں میرے محترم بزرگ پنڈت منوہر لال زتشی مرحوم نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں انگریزی کے بجائے اردو میں شعر کہنے کی کوشش کروں اسے میں خوش قسمتی کہوں یا وقت کی بات کہوں کہ میں نے یہ رائے خالی قبول ہی نہیں کی بلکہ اس روز سے انگریزی میں کہنا بند کر دیا اور اردو میں شعر کہنے کی کوشش کی ............ میری پہلی کوشش کا نتیجہ میری نظم ''پرستار حسن'' ہے، جو جوئے شیر میں شامل ہے۔'' (۱)

جوئے شیر کے علاوہ بھی ملا کی یہ نظم منشی دیا نرائن نگم نے ماہنامہ زمانہ کانپور میں اپنے ایک ایڈوٹوریل نوٹ کے ساتھ شائع کی، یہ ملاحظہ فرما کر پنڈت منوہر لال زتشی کا اصرار اور زور پکڑ گیا، جس کے نتیجہ میں ملا اردو میں باقاعدہ طور سے نظمیں کہنے لگے۔

پنڈت آنند نرائن ملا کو اردو میں شاعری کرنے کی تحریک تو پنڈت منوہر لال زتشی نے دی تھی۔ انہیں کے کہنے پر انہوں نے اردو شاعری کی طرف رخ کیا تھا لیکن اردو میں ملا کا پہلا شعر کیا تھا اس بارے میں انہوں نے خود تحریر کیا ہے:

''حسین آباد کے طرحی مشاعرے ۱۹۲۲ء یا ۱۹۲۳ء میں ...... جس میں شاہان اودھ کی قد آدم تصویریں ہیں مجھے یہ بخوبی اس واسطے سے یاد ہیں کہ گو میں مشاعرے میں بحیثیت شاعر شریک نہ تھا پھر بھی میں نے اس طرح پر دو ایک الٹے سیدھے مصرعے جوڑ لئے تھے۔ میں اس وقت تک یہ نہیں سمجھتا تھا کہ مجھ میں بھی شعر کہنے کی صلاحیت ہے، مجھے اپنا ایک شعر یاد آتا ہے:

میرے آنسو کے ہر قطرے میں اک تربت ہے ارماں کی
یوں ہی ایک ایک کر کے لٹ گیا سب کارواں میرا (۲)

---

(۱) پنڈت آنند نرائن ملا سے ایک انٹرویو پروفیسر سید احتشام حسین فروغ اردو لکھنؤ فروری ۱۹۷۴ء۔
(۲) کچھ نثر میں بھی ص ۱۴۳ پنڈت آنند نرائن ملا مکتبہ جامعہ لمٹیڈ دہلی ۱۹۷۴ء۔

# شاگردی

جہاں تک ملا کی شاگردی یا اصلاح سخن کی بات ہے ملا نے کبھی کسی کے سامنے زانوئے تلمذ نہیں تہہ کیا۔ کیونکہ فن شعر گوئی کے لئے جذبہ فطری اور وہبی کا ہونا ضروری ہے۔ تحصیل یا اکتساب سے اسے کوئی علاقہ نہیں، بقول ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی:

''ملکہ شاعری عطیہ قدرت اور جوہر فطری ہے، تعلیم یا اکتساب سے یہ جوہر کسی کو نصیب نہیں ہوسکتا۔ صرف جذبہ فطری یا تائید غیبی ہی کسی کو شاعر بنا سکتی ہے۔'' (۱)

آنند نرائن ملا کو یہ جذبہ قدرت سے ملا تھا۔ اس لئے فن شاعری میں ان کا کوئی استاد نہیں ہے اور نہ انہوں نے کسی سے کبھی کوئی اصلاح لی، یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ شاعری میراث پدری نہیں ہے کہ نسل بعد نسل اولاد میں منتقل ہوتی رہے۔ نیز یہ کہ گھریلو ماحول ملا کا ضرور ادبی تھا لیکن ان کے افراد خانہ میں کبھی کوئی شاعر نہیں ہوا تھا آنند نرائن ملا بطن مادر ہے سے موزونی طبع لیکر آئے تھے۔ کوئی بھی شاعر ابتداء میں فطری جذبہ کے تحت اس طرف راغب ہوتا ہے اور موزوں کلام کی طرح شعر گوئی کا آغاز کرتا ہے پھر کار بکثرت کے طور پر رفتہ رفتہ وہ ترقی حاصل کر کے شاعری میں نمایاں مقام پالیتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

''جن لوگوں کی فطرت میں اس کا ملکہ ہوتا ہے ان کی طبیعت ابتدا ہی سے راہ دینے لگتی ہے۔ اگر وہ کسی وجہ سے اس طرف متوجہ نہیں ہوتے تو طبیعت کا اقتضا ان کو جبراً اس طرف کھینچ لاتا ہے۔ وہ جب اس کی طرف توجہ کرتے ہیں تو ان کو کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور ملتی ہے اور اس کیلئے ان کا دل روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ ان کو اپنی قوت ممیّزہ پر پورا بھروسہ ہوتا ہے۔'' (۲)

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب شاگرد استاد کے خیالات کا خود کو اسیر کردیتا ہے تو اپنی اصل شخصیت کو

(۱) جگت موہن لال رواں اناؤی حیات اور ادبی خدمات ص ۴۲ ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۴ء۔
(۲) مقدمہ شعر وشاعری ص ۹۸ مولانا الطاف حسین حالی یوپی اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۸۲ء۔

فراموش کر بیٹھتا ہے۔ ملا کے سامنے یہ حقیقت تھی اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''میں اپنے دور کے ان معدودے چند شعراء میں ہوں، جنہوں نے اپنے ذوق ہی کو اپنا رہنما بنایا اور کسی استاد سے اصلاح نہ لی۔ لیکن اصلاح لینا ایک چیز ہے اور کسی عظیم فنکار کے رنگ کلام اور انداز فکر سے متاثر ہونا اور اس حد تک متاثر ہونا کہ اس کا پرستار بن جانا دوسری چیز ہے۔ اگر ایسے تاثر کو شاگردی کا نام دیا جاسکتا ہے تو میں کیا اقبال سے لے کر آج تک نہ جانے کتنے شاعر غالب کے شاگرد کہے جاسکتے ہیں:

مہر غالب نہ ابھرتا تو نہ دیتی یہ چمک
خاک ملا تو اقبال کی چوٹی بھی نہیں (۱)

یہ حقیقت ہے کہ ملا فکری سطح پر اقبال و غالب کے قریب ہیں ان اساتذہ کی شاعری آفاقی شاعری تھی، یہ اپنے دور میں محصور نہیں کی جاسکتی ان کی شاعری نے ایک دنیا کو متاثر کیا۔ ملا کا ذہن بھی آفاقی تھا، اس لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اقبال و غالب کی سطح کے نیچے درجہ استاد سے متاثر ہوتے یا کسب فیض کرتے۔ ملا کی نگاہ میں یہ دو ایسے درخشندہ ستارے تھے، جو متاخرین کے لئے مشعل ہدایت ثابت ہوئے ملا نے ان ہی اساتذہ کے چراغوں سے اپنے چراغ جلائے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی سے نہ اصلاح لینے کے اسباب ملا نے خود بتائے ہیں:

''ایک تو یہ کہ میں نے اردو شاعری ۲۰ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد شروع کی، میرے دل میں خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی اور شاید میرے دل میں ایک احساس برتری بھی تھا، جو مجھے اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ میں کسی ایسے شخص سے، جس کے پاس ڈگریاں نہ ہوں اور جس کی واقفیت مجھ سے بہت کم ہو، مشورہ سخن کروں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ شروع شروع میں انگریزی ادب کے زیر اثر میں نے نظمیں کہیں میرے زمانے کے اساتذہ غزل گو شعراء تھے اور جس قسم کی نظمیں میں کہتا تھا وہ ان کے مذاق سے بہت دور تھیں۔ ایسی صورت میں وہ زیادہ سے زیادہ انداز بیان کے نقائص بتا سکتے تھے اور کوئی اصلاح وہ بھی نہ کر سکتے تھے۔''(۲)

---

(۱) کچھ نثر میں بھی ص ۱۱۸ آنند نرائن ملا مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۷۴ء۔
(۲) آنند نرائن ملا سے ایک انٹرویو احتشام حسین فروغ اردو لکھنؤ فروری ۱۹۷۴ء۔

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ملا کی خودداری اور خود شناسی اس امر کی بھی مانع رہی کہ کوئی اپنا کلام ملا کے نام منسوب یا معنون کردے چنانچہ ان کے استاد محترم مولانا رضا فرنگی محلی نے مع تخلص اپنا کلام جب ملا کے نام منسوب کیا تو یہ ادا ان کو قطعی پسند نہ آئی اور اس بات کا اظہار انہوں نے رضا صاحب نہ صرف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا بلکہ ایسا کرنے سے انہیں منع بھی کیا۔ اس بات کی تفصیلات بہ الفاظ ملا صاحب ملاحظہ فرمائیں:

''مرحوم محض ایک بڑے عالم ہی نہیں تھے بلکہ شاعر بھی تھے۔ ان کے بہت سے شاگرد تھے، ان میں راجہ اشفاق علی خاں بھی تھے، چنانچہ جب راجہ صاحب کا دیوان شائع ہوا تو اس میں مولانا کے کئی قطعات شامل تھے، اور ان کے سب شاگردوں کا بھی ایک ایک قطعہ شامل تھا۔ جب دیوان میرے ہاتھوں تک آیا تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس میں ایک قطعہ میرے بڑے بھائی کے نام سے اور ایک میرے نام سے شائع کیا گیا تھا۔ مولانا نے ہمارے تخلص بھی رکھ دیئے تھے۔ (۱) میرے بڑے بھائی کا تخلص کمال او رمیرا تخلص اثر شاگرد رضا لکھنوی درج تھا۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ میں نے یہ سلسلہ آگے بڑھنے نہ دیا اور تخلص قبول نہ کیا ورنہ لکھنؤ میں ایک کے بجائے دو اثر لکھنوی ہو جاتے۔ یہ دیوان غالباً ۱۳۳۴ھ میں شائع ہوا تھا کیونکہ جو قطعہ تاریخ میرے نام سے منسوب تھا اس کا دوسرا شعر مجھے اب تک یاد ہے، وہ یہ ہے:

مجم میں لکھو تم اثر اس کی تاریخ
شاعر خوش بیان کا نایاب کلام (۲)

ان اقتباسات سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ملا نے شاعری میں اپنا استاد کسی کو نہیں بنایا۔ ان کے اندر شاعری کا وہبی جذبہ تھا، صرف اس قدر ہے کہ ان کے استاد پنڈت منوہر لال زتشی کی ذرا سی تحریک نے ان کے اندر سوئے ہوئے اشہب فطری کو بیدار کر دیا اور انہوں نے اپنی انفرادیت کو روپ دینے کیلئے شاعری شروع کر دی۔ اپنے ذوق نظر اور تخیل کی بلند پروازی کے بل پر اپنے معاصرین شعراء میں ممتاز مقام پر فائز ہوئے۔ ملا میں شاعری کا جذبہ قدرتی طور پر موجود تھا ان کے ذہن رسا کا یہ حال تھا کہ جو بھی

(۱) ملا کے ایک بڑے بھائی بھی تھے، ان کا انتقال چند سال پہلے ہی ہو گیا تھا ان کا قیام ملا کے یہاں ہی رہتا تھا۔ لیکن ذوق ومزاج الگ الگ تھے۔
(۲) کچھ ذرے کچھ تارے آنند نرائن ملا انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ستمبر ۱۹۵۹ء۔

اشعار ان کے ذہن میں آتے نقش ہو جاتے تھے ان کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے کبھی قلم و کاغذ کا سہارا نہیں لیا۔ صرف اپنے غضب کے حافظہ کی بدولت ازبر کر لیتے تھے۔

ملا کا انداز شعر گوئی مترنم تھا، پھر بھی ترنم کی لے میں بھی آواز میں کبھی کبھی کرختگی پیدا ہو جاتی تھی اپنی ایک کتاب ''کچھ ذرے کچھ تارے'' میں وہ کہتے ہیں:

جناب ملا کروں میں کچھ عرض آپ اس کی جو دیں اجازت

کلام اپنا بہ لحن پڑھنے کی کیوں اٹھاتے ہیں آپ زحمت

گلے میں ہے آپ کے جو سرگم کوئی نہیں ان سروں سے واقف

سمجھنے والا ہی جب نہیں ہے تو فن دکھانے کی کیا ضرورت (۱)

ملا نے جس طرح کبھی استاد کے روبرو زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا اسی طرح انہوں نے کبھی اپنا کوئی شاگرد نہیں بنایا وہ یہ نہیں پسند کرتے تھے کہ کسی پر زبردستی اپنی فکر و نظر لادیں۔ اب تو دور حاضر میں استادی اور شاگردی کی وہ قدیم روایت بھی نہ رہی، جو قدماء میں مروج تھی آج کی اردو شاعری اگر نہایت صاف گوئی سے تجزیہ کیا جائے تو قافیہ پیمائی کی حدود سے بھی بے نیاز ہو چکی ہے۔

## لکھنؤ کی ادبی فضا عہد ملا میں

ملا کی ادبی اور شعری زندگی کا آغاز لکھنؤ ہی میں ہوا تھا۔ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں لکھنوی تہذیب کا نقطۂ عروج تھا حالی اور آزاد کی جدید تحریک کا اثر لکھنؤ میں بھی رونما ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں غزل جو اردو شاعری کی آبرو کہی جاتی تھی اس کی لکھنوی شعراء میں بڑی دھوم تھی۔ اس زمانے کے لکھنوی شعراء نے اپنی غزلوں کی بنیاد دہلوی رنگ تغزل پر رکھی تھی، جس کے نتیجے میں لکھنؤ کے شعراء کے یہاں بھی رنگ تغزل میں متانت سنجیدگی اور ہمہ گیری پیدا ہو گئی تھی اس کے علاوہ بھی اسلوب کی جدت کو غزل

---

(۱) کچھ ذرے کچھ تارے آنند نرائن ملا انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سمبر ۱۹۵۹ء۔

کے دوسرے خصائص پر مقدم کیا جانے کا رجحان پیدا ہوا اور نیا شگوفہ یہ کھلا کہ غالب کے تخیل کو میر کی زبان میں ادا کرنے کی کوشش بھی کی جانے لگی۔ اس رنگ سخن کو اپنانے والوں میں صفی، عزیز، ثاقب، آرزو اور اثر کا نام خاص طور سے لیا جا سکتا ہے۔ ان اساتذہ کی نیک اور بھرپور کوششوں سے اردو غزل اس بلندی پر فائز ہوگئی، جہاں تک اکثر کی رسائی کم ہے۔ ملا کی شاعری شروع ہونے کے وقت لکھنؤ میں جدید غزل گو شعراء کی تعداد میں اچھا خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ حسرت، یگانہ، فانی، اصغر، جگر، سراج، قدیر، امیر مینائی، جلال، اسیر، چکبست، رسوا، حکیم دانش پیارے صاحب، رشید، ابر، بہار، فاخر وغیرہ نے اپنی غزلیہ شاعری سے پوری لکھنوی فضا میں زبردست دھوم مچا دی تھی۔

## مشاعروں میں شرکت

لکھنؤ کی مختلف شعری اور ادبی انجمنوں میں طرحی مشاعروں کا رواج تھا۔ یہ مشاعرے اس زمانے کے جدید تقاضوں کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے تھے، جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے۔ ۱۸۹۹ء میں صفی لکھنوی نے ایک انجمن معیار ادب کے نام سے بنائی۔ کافی دنوں تک اس انجمن کے زیر اہتمام مشاعرے ہوتے رہے۔ انجمن معیار ادب کی افادیت بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

''نئی تحریک کا اثر لکھنؤ کی ادبی حلقوں پر بھی پڑا اور یہاں انجمن معیار ادب کی داغ بیل پڑی۔ انجمن معیار ادب کے اراکین نے حقیقی شاعری اور سوز و گداز کی طرف قدم بڑھایا اور لکھنؤ کے قدیم رنگ سے دامن کھینچا۔ صفی، عزیز، ثاقب، محشر وغیرہ نے میر کی شاعری کو اپنا آدرش قرار دیا اور اس طرح لکھنؤ کی ادبی زندگی میں ایک نیا موڑ پیدا ہو گیا۔'' (۱)

صفی کی دیکھا دیکھی دوسرے اراکین انجمن نے دوسری انجمنوں کو قائم کیا ان انجمنوں میں انجمن معین الادب کا نام خاص طور سے ذکر کے لائق ہے۔ انجمن معیار ادب میں یہ ٹکڑے کیوں کر ہوئے اس بحث سے

(۱) ادبی تنقید ص ۲۰۹ ڈاکٹر محمد حسن۔

قطع نظر صرف معیارادب کے افادی پہلو کا ذکر مفید ہو سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ انجمن معیارادب اور رسالہ معیار نے جدید عصری تقاضوں کو پورا کرنے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ معیارادب کے کمزور ہونے پر اس کی جگہ انجمن معین الادب نے لے لی۔ سرتیج بہادر اس کے سرپرست تھے اور حضرت حسن لکھنوی صدر۔ بہار لکھنوی سکریٹری، سختی یہ تھی کہ اس زمانے میں ہر کس و ناکس آسانی سے اس انجمن کا ممبر نہیں بن سکتا تھا اس انجمن کے زیر اہتمام سب ہی مشاعرے طرحی ہوتے تھے۔ حلقۂ ممبران میں مصرعہ طرح تقسیم کر دیا جاتا تھا ہر طرف ایک دھوم سی ہو جاتی تھی۔ شرط یہ تھی کہ طرح اس طرح نکالی جاتی تھی کہ سات یا نو قافیے ہر شاعر کیلئے مخصوص کر دئے جاتے تھے کہ انہیں قوافی کے التزام سے ہی غزل سنی جائے گی اور مطلع کیلئے الگ سے صرف ایک قافیہ مختص ہوتا تھا۔

اسی انجمن میں بزرگ استادوں کا زور تھا۔ اس وجہ سے معین الادب ہی کے ایک گروپ نے جو اپنے کو ینگ پارٹیYoung Party کے نام سے موسوم کرتی تھی اس نے اس سے الگ ہوکر ایک نئی انجمن معراج الادب کے نام سے قائم کرلی۔ اس میں سراج لکھنوی، حکیم آشفتہ، وزیر لکھنوی، شمس لکھنوی، منظر لکھنوی، سحر لکھنوی اور گہر لکھنوی وغیرہ شامل تھے۔ صرف یہیں پر بس نہیں ہوا معراج الادب کے بعد بہارادب بنائی گئی۔ بہارادب کے بعد فردوس ادب اور بزم شعراء نے مرکزی حیثیت اختیار کرلی۔ فردوس ادب کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعرے یوم آتش، یوم ناسخ، یوم خواجہ وزیر، یوم چکبست اور یوم آسی وغیرہ یادگار ہیں۔

انجمن بہارادب:- پنڈت آنند نرائن ملا نے اپنے زمانے کی لکھنؤ کی ادبی اور شعری انجمنوں میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ معین الادب کے جنرل سکریٹری بہار صاحب کی وفات کے بعد معین الادب اور معراج الادب کے الحاق کے بعد ایک نئی انجمن بہارادب کی تشکیل ہوئی، مولانا صفی لکھنوی پہلے اس کے سکریٹری مقرر ہوئے بعد میں تاحین حیات اس کے صدر رہے پنڈت آنند نرائن ملا نے اس گروپ کو بہار ادب میں اپنی ان تھک کوششوں سے شامل کرلیا تھا حالانکہ اس گروپ نے بہارادب میں شامل ہونے کے

بجائے یہ فیصلہ کیا تھا کہ معین الادب کو ختم نہ کیا جائے لیکن جلدی ہی اس شرط پر بہار ادب کو تسلیم کر لیا گیا کہ ایک سال ملا صاحب اس کے سکریٹری ہوں گے اور دوسرے سال سید آل رضا صاحب۔

ملا صاحب اپنی طالب علمی کے زمانے سے مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ کیننگ کالج میں تو مشاعرے ہوتے ہی تھے، جن میں اساتذہ تک شریک ہوتے تھے اور کبھی کبھی ملا صاحب کی کوٹھی پر محافل مشاعرے کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ ملا کی ان تمام ادبی سرگرمیوں کا اگر ہم جائزہ لیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عہد ملا میں لکھنؤ کی شعری فضا اپنے عروج پر تھی اور دوسری بات یہ کہ لکھنؤ کی شعری انجمنوں اور مشاعروں میں شرکت نے مل جل کر ملا کے فطری ذوق شعر کو پروان چڑھایا خاص بات لائق ذکر یہ ہے کہ ملا صاحب کی کسی سے رنجش یا شاعرانہ چشمک نہیں تھی۔ وہ بزرگوں کا احترام کرتے اور مبتدیوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اس کو ہم ملا کی عالی ظرفی کہیں یا وسیع القلبی یہ بات طے ہے کہ لکھنؤ کے مشاعرے عموماً ملا کے نہ ہونے سے سونے اور نامکمل سمجھے جاتے تھے۔

ملا کبھی سستی شہرت Sheap Publicity کے شائق نہیں رہے اس لئے کسی ایسے نظریاتی پلیٹ فارم سے وابستہ نہ رہے، جوان کا نام اچھالتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو وہ مقام نہیں مل سکا، جس کے وہ بجا طور پر حقدار ہوتے تھے نیز یہ کہ مجموعی طور سے ان سے اس زمانے میں بھی اور آج تک خال خال ہی ان کا ذکر آتا ہے۔ اس ناقدری زمانہ کا ان کو بخوبی احساس تھا لیکن وہ مطمئن بھی تھے کہ آج نہیں تو کل ان کو پسند کرنے والوں کی کمی نہ ہوگی، جیسا کہ ان کے اس شعر سے واضح ہوتا ہے:

میرے سر میں ابھی ملا یہ خلل باقی ہے
آج گمنام ہوں لیکن ابھی کل باقی ہے

اسی طرح کا اظہار انہوں نے ''میری حدیث عمر گریزاں'' کے مقدمے میں بھی کیا ہے:

''میں اپنے بارے میں جانتا ہوں کہ اس دور کے بہت سے نقاد جب موجودہ ادب کا جائزہ لیتے ہیں اس وقت ان کے حافظے سے میرا نام اس طرح غائب ہو جاتا ہے، جس طرح چینی نقشوں سے میک ماہن

لائن (Mac Mahan Line) بعض دوسرے نقاد نام تو لیتے ہیں لیکن چونکہ میری قدریں مختلف ہیں مجھے گمراہ سمجھتے ہیں۔'' (۱)

پروفیسر آل احمد سرور کا بھی یہی خیال ہے، وہ لکھتے ہیں:

''وہ چونکہ کسی حلقہ یا برادری سے وابستہ نہیں ہیں، اس لئے عام طور پر لوگوں نے ان سے بے اعتنائی کی ہے حالی کی طرح اگرچہ ان کا مال نایاب ہے مگر گاہک اکثر بے خبر ہیں، انہوں نے کسی لیبل کی آڑ نہیں لی، وہ شاعری کی محفل میں کوئی پینترا یا ڈھول لے کر نہیں آتے ہیں۔'' (۲)

شاعر یا ادیب کی شہرت اس کی مقبولیت کی دلیل نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی تخلیقات کا پر مغز مطالعہ اور اس کی شاعرانہ قدر کو تعین کرنا ہی اصل چیز ہے۔ ملا کو یقین بھی ہے کہ ان کا پیام انسانی رشتۂ وحدت پر آج کوئی توجہ دے نہ دے کل جب اس کی توجہ اس طرف مرکوز ہوگی یہ وہی منزل ہوگی، جہاں سے ملا کا فن بقائے دوام حاصل کر لے گا، اس بات کی دلیل کے طور پر ملا کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

سطح مذاق بزم پہ ملا اثر کے آنہ تو
اوروں کا جو کمال ہے میرے لئے زوال ہے

عرصہ شعر میں ہے شاہسوار یکتا
نام ملا کا مگر پانچ سواروں میں نہیں

کیا بات ہے ملا میں کہ نقادوں کے باوصف
وہ انجمن شعر میں گمنام نہیں ہے

---

(۱) مقدمہ میری حدیث عمر گریزاں از آنند نرائن ملا انڈین پریس پرائیوٹ لمیٹیڈ الہ آباد دسمبر ۱۹۶۳ء۔
(۲) مقدمہ جوئے شیر ص ۲۴ پروفیسر آل احمد سرور نامی پریس لکھنؤ ۱۹۴۹ء۔

# ملا کی شعری تخلیقات

(۱) ''**جوئے شیر**'' ملا کا پہلا شعری مجموعہ ہے، جو ان کی ۲۴ سالہ شعری کاوشوں کا ثمرہ ہے، جوئے شیر ۱۹۴۹ء میں نامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا، اس کا مقدمہ پروفیسر آل احمد سرور نے تحریر کیا ہے، اس میں ۱۲۸ غزلیں، ۶۷ منظومات، ۳۸ رباعیات کے علاوہ سوز ناتمام کے تحت ۷۷ متفرق اشعار ہیں، یہ مجموعہ ۳۹۲ صفحات پر مشتمل ہے، اس مجموعہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی غزلوں اور نظموں کو بحساب سنہ تخلیق درج کیا گیا ہے، جس سے ان کے شاعرانہ ارتقا کا ادراک بہم پہونچتا ہے۔

ملا نے اس کا انتساب کسی شخصیت کے نام نہ کر کے مٹتی ہوئی اردو کے نام کیا ہے، جو ان کو اپنے مذہب سے بھی زیادہ عزیز تھی، اس سلسلے میں ان کی یہ دبی کسک ملاحظہ کیجئے:

اک موت کا جشن بھی منالیں تو چلیں
پھر پونچھ کے اشک مسکرالیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگاکے مٹی ہوئی اردو
اک آخری گیت اور گالیں تو چلیں

(۲) ''**کچھ ذرے کچھ تارے**'' یہ ملا کا دوسرا شعری مجموعہ ۱۴۷ صحافت کا ہے، اسے سرفراز پریس لکھنؤ نے ستمبر ۱۹۵۹ء میں شائع کیا تھا، اس میں پیش لفظ یا مقدمہ نہیں ہے، اس پر حکومت اترپردیش نے انہیں غالب ایوارڈ سے سرفراز کیا تھا، سرورق پر یہ شعر تحریر ہے:

وادی شعر میں یہ جادۂ ملا تو نہیں
اک الگ ہٹ کے نشان کف پا ہے تو سہی

اور دوسرے ورق پر یہ شعر درج ہے:

اپنے پیروں پہ ہمیشہ سے کھڑا ہے ملا
اس کے قد میں کوئی حصہ کسی شانے کا نہیں

اس مجموعہ میں ۴۹ غزلیں، ۲۱ نظمیں، ایک قطعہ اوران کی شہرہ آفاق نظم مریم قانی شامل ہیں۔

(۳) ''**میری حدیث عمر گریزاں**'' دسمبر ۱۹۶۳ء میں یہ مجموعہ انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا تھا، ۳۶۰ صفحات کے اس مجموعہ کے سرورق پر یہ شعر درج ہے:

بکھری پڑی ہے ان وادیوں میں
میری حدیث عمر گریزاں

کتاب کا انتساب آنے والے کل کے نام ہے، اوراس سلسلے میں یہ رباعی درج ہے:

میرے سر میں ابھی ملا یہ خلل باقی ہے
آج گمنام ہوں لیکن ابھی کل باقی ہے
نقش پا سے ابھی روشن نہ سہی راہ ادب
میری تابانی کردار وعمل باقی ہے

اس مجموعہ سے ملا نے بشکل حظ چودہ صحافت کو محیط جامع و مدلل فن و فنکار، جنون وخرد، تنقید ونقاد، صالح و بیمار، ادب عالیہ، حقیقت وداخلیت ورمزیت غزل جیسے باریک مسائل پر روشنی ڈالی ہے، جس سے اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ اس کتاب کا خالق محض شاعر نہیں بلکہ ادب عالیہ کے جملہ فنون کا بھی اسے ادراک حاصل ہے۔ اس مجموعہ میں جوئے شیر کی ۸۵ غزلیں، ۷۴ نظمیں، ۳۲ رباعیات ہیں، سوز ناتمام کے تحت ۲۵ متفرق اشعار ہیں، '' کچھ ذرے کچھ تارے'' سے ۴۲ غزلیں، ۱۸ نظمیں لی گئی ہیں اور لویں کے تحت ۲۵ راشعار متفرق ہیں، دوسرے حصے یعنی تازہ کلام کے عنوان سے ۱۱ غزلیں، ۵ نظمیں ایک قطعہ اور ۲ متفرق اشعار ہیں، اس مجموعہ پر ملا کو جنوری ۱۹۶۵ء میں ساہتیہ اکیڈمی سے پانچ ہزار روپیہ کا ایوارڈ ملا تھا۔

(۴) ''**سیاهی کی ایک بوند**'' ملا کی اس شہرہ آفاق تصنیف کو اپریل ۱۹۷۳ء میں نامی پریس لکھنؤ نے شائع کیا تھا، جشن ملا کمیٹی لکھنؤ کے زیراہتمام ۸ر پریل ۱۹۷۳ء کو رویندرالیہ لکھنؤ میں محترمہ اندرا گاندھی کے ہاتھوں اس کی رسم اجراء ہوئی تھی۔ ۲۵۶ صفحات کے اس شعری مجموعہ میں ۲۴

غزلیں، ۶۳ نظمیں، ۸ قطعات، ۲ رباعیاں اور ۱۴ امفرد اشعار ہیں، جس میں جوئے شیر سے ۹، کچھ ذرے کچھ تارے سے ۲، میری حدیث عمر گریزاں سے ۵، کل ۱۶ نظمیں ان کے پہلے شعری مجموعوں سے ماخوذ ہیں اور باقی ۴۷ نظمیں تازہ اشعار پر مشتمل ہیں۔ ان میں ۲۱ نظمیں سنسکرت ادب سے ماخوذ ہیں، بیشتر آزاد نظمیں ہیں۔ غزلیں تازہ ہیں ردیف ''ل'' کی پوری غزل اور ردیف ''ی'' کی پہلی غزل میں ۱۵/۱ اشعار پہلے کے ہیں، جو اسی ردیف و بحر میں کچھ ذرے کچھ تارے میں شامل ہیں۔

اس کے سرورق پر ملا کا یہ شعر درج ہے:

خون شہید سے بھی ہے عظمت میں کچھ سوا
فنکار کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند

مجموعہ کا انتساب محترمہ اندرا گاندھی کے نام ہے اور اس سلسلے میں یہ اشعار درج ہیں:

نظروں میں تری خواب ہیں ہاتھوں میں علم ہے
تو قوم کی للکار ہے تو قوم کا دم ہے
جلتا ہوا دیپک ترا ہر نقش قدم ہے
ہستی پہ تری نازہو جتنا ہمیں کم ہے
اس ملک کی قسمت ترے ماتھے پہ رقم ہے

اعتراف کے عنوان سے کتاب کا مقدمہ علی جواد زیدی کا محررہ گیارہ صحافت پر مشتمل ہے، جو ملا کی شاعری پر مختلف جہات سے روشنی ڈالتا ہے۔

(۵) ''**کرب آگہی** '' ۲۱۱ صحافت کو محیط یہ شعری مجموعہ ۱۹۷۷ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس کا مقدمہ نقش کف پا کے عنوان سے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے تحریر کیا تھا اس مقدمہ میں موصوف نے ملا کی شاعری کے مختلف جہات اور پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں ۶۰ غزلیں ہیں، جن میں سے ''میری حدیث عمر گریزاں'' سے ۱۷، ''سیاہی کی ایک بوند'' سے ۴ اور ''کچھ ذرے کچھ تارے'' سے

۱۶غزلیں ہیں۔اس طرح باقی ۲۳غزلیں تازہ ہیں۔

(۶)''**جادہ ملا** ''۱۵۳صفحات کا یہ مجموعہ ۱۹۸۸ء میں انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا تھا۔ ۱۶صفحات کا پیش لفظ ڈاکٹر خلیق انجم کا محررہ ہے۔اس مجموعہ میں جوئے شیر سے ۱۵، ''کچھ ذرے کچھ تارے'' سے ۵، ''میری حدیث عمر گریزاں'' سے ۵/اور ''سیاہی کی ایک بوند'' سے ۲۰نظمیں۔اس طرح منتخب شدہ نظموں کی تعداد ۴۰ ہے۔

(۷)''**انتخاب کلام آنند نرائن ملا** ''۱۹۶۰ء میں سرفراز قومی پریس لکھنؤ نے انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کی طرف سے اردو شاعروں کا انتخابی سلسلہ کے تحت ۶۴ صفحات کا مختصر انتخاب شائع کیا تھا۔اس میں صرف جوئے شیر کی ۱۹غزلیں، ۱۱نظمیں اور ۱۵رباعیاں ہیں نیا کلام کچھ نہیں ہے۔

یہ سبھی مجموعے ملا کی شاعری کے ارتقائی سفر اور ان کے فن وفکر نیز شاعرانہ عظمتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ان سبھی مجموعوں میں ملا کی منفرد آواز،فکر کی گہرائی زبان کی سادگی، شگفتگی رنگینی اور موضوعات پر دسترس کو ظاہر کرتی ہیں۔ملا کے کسی مجموعہ کو ایک دوسرے پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ بقول پروفیسر جگناتھ آزاد:

''ملا صاحب ہمارے ملک کے ان نامور شعراء میں ہیں، جو اپنی زندگی میں ہی تاریخ ادب کا جزو بن گئے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی فکر کا جہاں ہمیشہ ارتقا پذیر رہا ہے صداقت کی جستجو کرنے والے فکر اور ارتقاء مرحلے طے کرنے والے فن کے امتزاج نے ملا صاحب کی شاعری کو ایک مخصوص دلکشی اور دلآویزی عطا کی ہے۔''(۱)

ان سب کے علاوہ ملا صاحب کی نثری تصنیفات میں ''یاد چکبست'' اور ''مضامین نہرو'' کو انڈین پریس الہ آباد نے یکے بعد دیگرے دونوں کو ۱۹۳۹ء میں شائع کیا تھا،تیسری کتاب ''کچھ نثر میں بھی'' مکتبہ جامعہ لمٹیڈ دہلی نے ۱۹۷۵ء میں شائع کی ہے۔

پنڈت آنند نرائن ملا ارود کے صف اول کے شاعر ہونے کے علاوہ اردو کے زبردست حمایتی تھے،

---

(۱)ہماری زبان ہفتہ وار دہلی ۲۳/مئی ۱۹۷۵ء پروفیسر جگناتھ آزاد۔

اس سلسلے میں ان کے کارہائے نمایاں ہمیشہ یادر ہیں گے۔ مشہور افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم ملا صاحب کی اردو خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جو چراغ انہوں (چکبست) نے روشن کیا تھا آنند نرائن ملا اسے تیل دے رہے ہیں اور ان کی اور سرتیج بہادر سپر داور دیگر فدایان ادب اردو اور محبان اردو ادب کی کوششوں سے یہ چراغ ہندوستان میں انشاء اللہ بجھنے نہیں دیا جائے گا۔''(۱)

یہ سچائی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ چکبست نے اردو کا چراغ جلایا تھا وہ ہزاروں باد تند و تیز کے باوجود ملا صاحب کی کوششوں سے نہ صرف روشن ہے بلکہ اتنا تابناک ہے کہ اس سے پورا ملک منور ہے۔ ملا کا یہ حوصلہ لائق ستائش ہے کہ آج سے قریب ۳۵ سال پہلے انہوں نے آل انڈیا اردو کانفرنس میں اپنے خطبہ صدارت میں بیانگ دہل اعلان کیا تھا:

''میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن زبان نہیں چھوڑ سکتا ہوں، کیونکہ زبان میری ذلت کا آئینہ ہے میری میراث ہے، میری تاریخ ہے، میری زندگی ہے۔''(۲)

ملا صاحب کا یہ کہنا صرف صحیح ہی نہیں بلکہ واقعیت ہے، تاریخ ہے ان کی مادری زبان اردو ہے، ہندی سے وہ نابلد ہیں اردو انہوں نے آغوش مادر سے سنی سیکھی اور تن من سے اسے متاع عزیز کی طرح گلے لگایا اور پورے عزم وحوصلے سے اسے قانونی حیثیت دلا کر اسے اس کا مقام دلانے کی سعی بلیغ کرتے رہے ملا کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور نے جو رائے قائم کی ہے اس میں شک کا شائبہ نہیں ہے، وہ لکھتے ہیں:

''ہندوؤں میں کشمیر کے پنڈت جو تاریخ ہند میں اپنی ذہانت اور طباعی کیلئے مشہور ہیں اردو ادب کی خدمت کیلئے کم مشہور نہیں، یہ خادم نہیں مخدوم ہیں۔''(۳)

اس ضمن میں فطرت واسطی کا یہ شعر دیکھئے:

---

(۱) یاد چکبست آنند نرائن ملا انڈین پریس الہ آباد۔

(۲) کچھ نثر میں بھی ملا مکتبہ جامعہ لمٹیڈ دہلی دسمبر ۱۹۷۵ء۔

(۳) تنقیدی اشارے آل احمد سرور سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔

آج ہے سرتیج و ملا پر نظر
روح اردو ڈھونڈھتی ہے ایسے ہی لعل و گہر

خود ملا نے اپنی نثری کتاب ''کچھ نثر میں بھی'' کے رسم اجراء کے موقع پر کہا تھا:

''میں نے ہزاروں مقدمات کی پیروی کی ہے اور بعض بہت ہی کمزور مقدموں میں بھی مجھے فتح حاصل ہوئی ہے، لیکن اردو کا مقدمہ ایسا ہے، جو میری زندگی کے تمام مقدمات میں سب سے زیادہ جاندار ہے، لیکن اس میں ابھی تک مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے اور تاریخوں پر تاریخیں لگتی چلی جا رہی ہیں۔''(۱)

لیکن ملا کی زندگی میں ہی کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ ملا اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ لیں گے۔ مختلف شہروں میں اردو اکیڈمیوں کا قیام، ترقی اردو بیورو بہار اور یوپی میں اردو کو دوسری رکاری زبان کا درجہ ملنا یہ سب کچھ نہ کچھ اردو کی بہبود کی شکلیں ہیں۔ لگ بھگ نصف صدی قبل ملا نے اردو کے متعلق کچھ اشعار قلمبند کئے تھے، جن میں ملا کا اردو سے لگاؤ ظاہر ہوتا ہے:

لب مادر نے ملا لوریاں جس میں سنائی تھیں
وہ دن آیا ہے اب اس کو بھی غیروں کی زباں سمجھو

(جوئے شیر ص ۲۶)

ملا بنادیا ہے اسے بھی محاذ جنگ
اک صلح کا پیام تھی اور اردو زباں بھی

(جوئے شیر ص ۱۴۱)

یہ سانحہ چہل دنو میں جو ہوا
ہندی کی چھری تھی اور اردو کا گلا
اردو کے رفیقوں میں جو مقتول ہوئے
ملا نامی سنا شاعر بھی تھا

---

(۱) ہماری زبان دہلی یکم فروری ۱۹۷۶ء۔

اک موت کا جشن منالیں تو چلیں
پھر پونچھ کے اشک مسکرائیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگاکر اے مٹتی ہوئی اردو
اک آخری گیت اور گالیں تو چلیں

ان اشعار میں اردو کے عروج وزوال کی داستان تو ہے ہی ساتھ ہے وہ میٹھی لوری بھی ہے، جو اردو بیورو، اردو اکیڈمی کے قیام اور بہار و یو پی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کرنے کے شکل میں پیش کی گئی ورنہ اردو کی حالت دن بدن ایسی گر رہی ہے کہ ملا کا یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے: ع -''آ تجھ کو گلے لگا کے اے مٹتی ہوئی اردو'' اردو بلاشبہ مٹ رہی ہے اور یہ سوچنا کہ یہ مٹ نہیں سکتی عہد حاضر کے تناظر میں محض خوش فہمی ہے۔ ملا کا ایک ایک مصرعہ ایک ایک لفظ درد و کسک لئے ہوئے ہے۔ اردو کے بستر مرگ پر سنایا گیا یہ ملا کا مرثیہ نہیں ہے، جسے وہ سنا کر چپ ہو رہے بلکہ اردو کو اس کا جائز حق دلانے کیلئے دل وجان سے سرگرم ہو گئے۔ اگر ملا کا یہ جذبہ صدق مقالی پر مبنی نہ ہوتا تو یہ جملہ ان کی زبان پر نہ آتا کہ اردو میری زبان ہے، میں مذہب بدل سکتا ہوں مادری زبان نہیں۔'' ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا یہ جملہ دلوں کو چھوتا ہے اس لئے کہ ''اردو سے یہ قلبی لگاؤ غزل کے پردے سے کہیں کہیں جھانکنے لگتا ہے۔''(۱)

فروغ اردو زبان کی تحریک میں اگر بہ نظر غور دیکھیں تو دو قسم کے چہرے نظر آتے ہیں اول وہ لوگ، جو سستی شہرت جلب منفعت نام ونمود کی غرض سے اردو زبان کا جھنڈا اٹھا رہے ہیں کثرت ایسے ہی نام نہاد اردو کے علمبرداروں کی ہے اور دوسرے وہ لوگ، جو ہر طرح کی مفاد پرستی سے بے نیاز ہو کر اردو زبان کو اپنا دین وایمان بنا کر اس کے حق کی حمایت میں ہمہ تن مصروف جہاد ہیں ایسے افراد معدودے چند ہیں، جن کی آواز مفاد پرستوں کے جم غفیر میں نقار خانہ میں طوطی کی آواز کی طرح سہم کر رہ جاتی ہے۔ ملا صاحب کا شمار دوسری قسم کی جماعت سے ہے۔

---

(۱) مقدمہ کرب آگہی گوپی چند نارنگ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی جنوری ۱۹۷۷ء۔

آزادی وطن کے ساتھ حالات نے ایسے پلٹا کھایا کہ اردو اپنی ہی جنم بھومی میں ملک بدر کردی گئی۔ مفاد پرستوں نے مصلحت پسندی کی اوٹ میں شہرت اور کرسی کے لالچ میں اردو کے رسم الخط کو بدلنے کا سجھاؤ دیا۔ یہ کوئی دانشمندانہ فعل نہیں تھا بلکہ اردو کے گلے پر خنجر پھیرنے کی ناعاقبت اندیش کوشش تھی۔

اردو کا رسم الخط اردو کا نہں فارسی رسم الخط ہے۔ اس کی لفظیات عربی فارسی ترکی بھاشا اور مقامی بولیوں کی ہیں۔ عربی فارسی ترکی الفاظ کا تلفظ اور صحیح املا ہندی رسم خط میں نہیں ادا ہوسکتا مثلاً لفظ ہے ذم بمعنی مذمت، ضم بمعنیٔ ملا دینا، زم بمعنیٔ ٹھہرنا، ہندی میں یہ سب जम لکھے جائیں گے۔ اس جگہ ان لفظوں کی معنویت فنا ہو جائے اسی قبیل کے ہزاروں ایسے الفاظ ہیں، جن کو ہندی میں لکھ کر معنیٔ کو بے معنیٔ کر دینا ہے۔ یہ حال صرف ہندو ادیب کا نہیں تھا بلکہ راہی معصوم رضا اور عصمت چغتائی وغیرہ جیسے افراد کا بھی تھا، جنہوں نے اردو کی روٹیاں توڑیں اور اسے قربان گاہ پر چڑھانے کا یہ سستا مشورہ دیا۔ پنڈت آنند نرائن ملا کی طرح اگر دوسرے ادیبوں خواہ ہندو ہوں یا مسلمان نے خلوص نیت سے اردو کی آواز بلند کی ہوتی تو اردو کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔ لسانی منافرت کا عفریت نہ ڈس رہ ہوتا۔ ملا صاحب نے پرتشدد، پرخوف اور پرخطر حالات میں بھی اردو کی سرفروشانہ وکالت کی اور ہر حال میں اپنی مادری زبان اردو قرار دیتے اور لکھواتے رہے۔

## ملا بحیثیت صدر پارلیمانی اردو کمیٹی

دستور ہند کی رو سے صدر جمہوریہ کو ۱۲ ممبر نامزد کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے اس اختیار کے تحت جناب محمد عثمان خاں عارف، سکندر علی وجد، حبیب تنویر اور آنند نرائن ملا راجیہ سبھا کے ممبر نامزد ہوئے تھے۔ اس کمیٹی کا قیام مئی ۱۹۷۳ء میں ہوا تھا اور اس کا مقصد تھا کہ جن ریاستوں میں یا جہاں اردو داں عوام معتدبہ تعداد میں ہیں وہاں اردو کے مفاد کو فروغ دیا جائے۔

# بحیثیت نائب صدر انجمن ترقی اردو ہند

اس ادارے کا مقصد اردو کو ترقی دینا اور اس کے سرمایہ میں اضافہ کرنا تھا۔ ویسے تو اس کا قیام ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ میں ہوا تھا۔ اس کے پہلے سکریٹری شبلی نعمانی ہوئے۔ ان کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی، عزیز مرزا، مولوی عبدالحق، قاضی عبدالغفار، آل احمد سرور یکے بعد دیگرے ہوتے رہے صدور میں پہلے مسٹر آرنلڈ اور پھر نواب محسن الملک، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، نواب عماد الملک، سرراس مسعود، سرتیج بہادر سپرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، خواجہ عبدالحمید، کرنل بشیر زیدی صدر ہوئے۔ ان کے بعد پنڈت ہردے ناتھ کنزورد صدر اور نائب صدر آنند نرائن ملا اور خواجہ غلام السیدین ہوئے۔

بحیثیت صدر انجمن ترقی اردو ہند:- پنڈت ہردے ناتھ کنزرد کی دس سالہ خدمات ک بعد ۹ر جولائی ۱۹۷۲ء کو پنڈت آنند نرائن ملا صدر منتخب ہوئے ان کے نائب صدور ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور راج بہادر گور مقرر ہوئے۔ ملا صاحب نے اپنے کام کی دس سالہ مدت یعنی جون ۱۹۸۲ء تک بے لوث ہوکر انتہائی انہماک اور دلچسپی سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ مختلف ریاستوں کو اردو کی نشر واشاعت اور سرکاری حیثیت دلانے کے میمورنڈم بھیجتے اور اردو کے مسائل کے حل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

# بحیثیت چیئرمین اردو اکیڈمی اتر پردیش

۱۹۷۳ء میں جب یوپی میں اس کمیٹی کا قیام ہوا ملا اس کے صدر بنائے گئے جون ۱۹۷۴ء میں گورنر اتر پردیش نے جب اکیڈمی کی نئی تشکیل کی، ملا صاحب نے اپنے ذاتی کتب خانہ سے اکیڈمی کو ۶۹۴ کتابیں عطیہ کیں۔ ملا کے زمانے میں لکھنؤ اکیڈمی نے ایک مرکزی ادارے کی شکل اختیار کرلی تھی ان کے بعد پروفیسر محمود الٰہی صاحب کے عہد صدارت میں ملک کی تمام اکیڈمیوں کے مقابلے میں لکھنؤ اکیڈمی نمایاں فوقیت حاصل کر گئی تھی۔ چیئرمین اردو اکیڈمی، انجمن ترقی اردو ہند، فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی یا

ترقی اردو بورڈ میں اپنی بے حد مصروفیتوں کے باوجود اردو کاز کی حمایت میں ملا نے اپنا تن من صرف کر دیا انہیں کی کوششوں سے اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کے دور میں اردو کو بے حد سہولتیں ملیں۔ گجرال کمیٹی کی سفارشوں میں ملا کی بھی تجاویز شامل ہیں۔ ملا نے اردو کے مسائل حل کرنے اسے سرکاری درجہ دلانے کے بہت سے محضر نامے پیش کئے اور انہیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔

# ملا اور وفد انجمن ترقی اردو ہند

انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے ۸؍جون ۱۹۸۸ء کو ایک وفد وزیراعظم نرسمہا راؤ سے ملا تھا اس وفد میں ملا صاحب شریک تھے وزیراعظم کو ایک میمورنڈم دے کر مطالبہ کیا گیا تھا کہ اتر پردیش اور دوسرے صوبوں میں سہ لسانی فارمولا کے تحت اردو تعلیم کا باقاعدہ بندوبست کیا جائے خاص کر یوپی میں اگر اردو کے مسائل حل نہ کئے گئے تو دوسری ریاستوں پر اس کا خراب اثر پڑے گا کیونکہ تمام ریاستیں اتر پردیش کو ہی نمونہ بنا کر پیش کرتی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ مرکزی حکومت صدر جمہوریہ ہند سے سفارش کر کے اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلائے۔

اس کے بعد ۲۰؍اگست ۱۹۸۶ء کو دہلی میں آل انڈیا اردو مورچہ کنونشن طلب کیا گیا، جس کی صدارت پنڈت جگناتھ مصرا نے کی تھی۔ شرکائے وفد میں ملا صاحب کے علاوہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، کیفی اعظمی، اختر الایمان، ڈاکٹر خلیق انجم، مجروح سلطانپوری کے علاوہ حکومت کے ارباب حل وعقد نے بھی شرکت کی، اس کنونشن میں خاص طور سے اتر پردیش دہلی اور دوسری ریاستوں میں جہاں اردو بولی جاتی ہے وہاں اس کا قانونی حق دلانے کا مطالبہ کیا گیا۔ ملا صاحب کے ساتھ ایک وفد وزیراعظم سری راجیو گاندھی سے بھی مل کر ان سے یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ان تمام کوششوں سے بہار کے طرز پر ۱۹۸۹ء کو کونسل سے منظوری حاصل کر کے ۶؍اکتوبر ۱۹۸۹ء کو جناب عثمان عارف گورنر یوپی کی منظوری مل جانے پر یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا گراف اور نوٹی فکیشن جاری کیا گیا۔ اس طرح ملا کی

انتھک کوششوں سے اتر پردیش میں اردو دوسری سرکاری زبان کا مطالبہ پورا ہو جانے پر کڑوروں اردو والوں کے دیرینہ خواب پورے ہو گئے۔

آنند نرائن ملا کا زبردست کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نہایت دانشمندانہ طریقے سے اردو زبان کو تعصب اور تنگ نظری اور بے انصافیوں سے چھٹکارہ دلانے کیلئے ہمیشہ ان طریقوں کو اپنایا، جن میں تشدد کو ذرہ برابر بھی دخل نہ ہو۔ انہوں نے پارلیمنٹ کے اندر قانونی جنگ جارر کھی کل ہند اور ریاستی سطح پر منعقد اردو کانفرنس کے صدارتی خطاب میں اردو کی وکالت کی۔ محکمہ تعلیم کے ارباب حل وعقد کے پاس وفود لے کر گئے۔ انہوں نے جب بھی انجمنوں اور اکادمیوں میں کوئی ناچاقی تو خودرضا کارانہ طور پر مستعفی ہو جایا کئے۔ غرض کہ ملا صاحب آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو تحریک کے ان قافلہ سالاروں میں ہیں، جو سخت ترین حالات اور دشوار گذار و ناساز گار موقع پر پورے جوش وخروش سے اپنے حقوق کی بازیافت کیلئے سرگرم عمل رہے۔ انہوں نے مشکل ترین حالات میں بھی اردو کے پرچم کو جھکنے نہیں دیا۔ ملا کا کہنا تھا کہ اردو ایک مریضہ کی طرح ہے، جو ابھی صحت یاب ہوئی ہے۔ اس میں طاقت وتوانائی بحال کرنے کیلئے صحت مند ماحول، اچھی غذاؤں کی ضرورت ہے آج کچھ اچھا ماحول ہے لہٰذا اس سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ملا کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اردو قومی یک جہتی کی علامت ہے، وہ گنگا جمنی تہذیب کی زندہ تصویر ہے اگر ملک میں قومی یک جہتی ضروری ہے تو اس کیلئے اردو کی ترقی ضروری ہے اس میں خلوص ہے، محبت ہے، نفاست ہے اور شائستگی ہے، دلوں کو گرمانے کا ہنر ہے، ملا کے اردو زبان سے عشق کے سلسلے میں پروفیسر جگناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''اردو سے ملا کو محبت نہیں عشق ہے اردو خوش نصیب ہے کہ اسے ملا جیسا وکیل ملا۔ اردو کے لئے ملا صاحب نے کیا کچھ نہیں کیا، دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح سے اس زبان کو اس کا حق دلوانے کی کوشش کی اردو کے موضوع پر آپ کی شاعری اردو ادب کی متاع بے بہا ہے۔ یہاں اگر میں کہوں کہ ملا کی نظم مجاہد دراصل ملا صاحب کے اس جہاد کی تصویر ہے، جو انہوں نے اردو کیلئے ملک کے طول وعرض میں کیا تو غلط نہ ہوگا۔ اس نظم کا ایک ٹکڑا ملاحظہ کیجئے:

اور وقت جب آئے
اپنے خون کے سب قطرے
اپنے دل کے سب سپنے
اپنے لب کے سب نغمے
موت سے ملا کر آنکھ زندگی کو دے جائے
آج ہے مجاہد وہ جو ہر کام کر جائے (۱)

اس موضوع کو ان کی غزل میں دیکھئے، جہاں ایک دلکشی دلآویزی اور لطافت ہے:

اردو زبان غیر ہے یہ شوق سے کہئے
ملا سے لیکن آ کے نگاہیں ملائے تو
بزم ادب ہند کی ہر گل میں ہے خوشبو
ملا گل اردو کی مہک اور ہی کچھ ہے

## ملا کے اعزاز و انعامات

ملا صاحب کی اردو خدمات اور بے لوث مخلص خادم ہونے کی وجہ سے سرکاری نیم سرکاری اداروں کی جانب سے وقتاً فوقتاً اعزامات وانعامات ملتے رہے ہیں، جن کی وجہ سے ان کی ادبی حیثیت مسلم ہو جاتی ہے۔ ادبی انجمنوں، اکیڈمیوں اور دوسرے اداروں نے جو اعزامات دیے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) ممبر مجلس عاملہ ساہتیہ اکیڈمی (اردو مشاورتی بورڈ) ۱۸۶۳ء پانچ سال کیلئے۔
(۲) نائب امیر جامعہ اردو علی گڑھ ۲۵/ اکتوبر ۱۹۶۶ء سے ۲۸/ جولائی ۱۹۷۳ء تک چھ سال۔
(۳) نائب صدر انجمن ترقی اردو ہند دہلی اپریل ۱۹۶۸ء۔

---

(۱) ہماری زبان سہ ماہی دہلی ۲۲/ مئی ۱۹۷۵ء۔

(۴) ممبر مجلس عاملہ ساہتیہ کادمی (اردو مشاورتی بورڈ) ۱۹۶۸ء مزید پانچ سال کیلئے۔

(۵) صدر انجمن ترقی اردو دہلی ۹ر جولائی ۱۹۷۲ تا جون ۱۹۸۲ء دس سال۔

(۶) صدر پارلیمانی اردو کمیٹی مئی ۱۹۷۳ء۔

(۷) چیئر مین اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۷۳ء۔

(۸) چیئر مین فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ نومبر ۱۹۷۶ء۔

(۹) نائب صدر وا یکٹنگ پریسیڈنٹ ترقی اردو بورڈ بھارت سرکار ۱۹۸۳ء۔

(۱۰) نائب صدر انجمن ترقی اردو ہند دہلی مئی ۱۹۸۹ء۔

(۱۱) نائب چیئر مین اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ جولائی ۱۹۸۹ء۔

# غیر ادبی اعزازات وانعامات

(۱) چیئر مین ہند و پاک ٹریبونل ۱۹۴۶ء تا مارچ ۱۹۵۲ء۔

(۲) ممبر سنٹرل بار آف سپریم کورٹ دہلی۔

(۳) ممبر اودھ بار ایسوسی ایشن لکھنؤ۔

(۴) اعزاز منجانب آل انڈا کانگریس کمیٹی (شعبہ قانون) اگست ۱۹۸۹ء۔

ان اعزازات کے علاوہ ملا کو ادبی اکادمیوں نے جو انعامات دیئے وہ اس طرح ہیں:

(۱) یوپی حکومت غالب ایوارڈ (مشترکہ طور پر ملا اور فراق کو دیا گیا) برائے مجموعہ ''کچھ ذرے کچھ تارے''
(ملا) ۱۹۵۹ء۔

(۲) ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (پانچ ہزار روپیہ نقد) برائے مجموعہ ''میری حدیث عمر گریزاں'' (ملا) ۱۹۶۵ء۔

(۳) اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ برائے اعتراف ملا کی مجموعی ادبی خدمات۔

(۴) بہار اردو اکادمی ایوارڈ برائے اعتراف ملا کی مجموعی ادبی خدمات۔

(۵) دہلی اردو اکادمی ایوارڈ برائے اعتراف ملا کی مجموعی ادبی خدمات۔

(۶) ادبی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ایوارڈ دہلی برائے اعتراف ملا کی مجموعی ادبی خدمات ۱۹۸۰ء۔

(۷) غالب انسٹی ٹیوٹ (ایٹلس غالب ایوارڈ دہلی برائے اعتراف ملا کی مجموعی ادبی خدمات ۱۹۸۶ء۔

(۸) کلہن ایوارڈ منجانب کشمیری پنڈت ایسوسی ایشن دہلی برائے اعتراف ملا کی مجموعی ادبی خدمات۔

(۹) حسرت موہانی ایوارڈ منجانب عالمی اردو کانفرنس دہلی برائے اردو غزل ۱۹۸۸ء۔

(۱۰) ہریانہ اردو اکادمی ایوارڈ پچاس ہزار روپیہ نقد

(۱۱) فخر الدین علی احمد ایوارڈ لکھنؤ برائے خدمات اردو شعر وادب ۱۹۸۹ء۔

(۱۲) علامہ اقبال سمان حکومت مدھیہ پردیش ایک لاکھ روپیہ نقد ۱۹۹۱ء

# ترقی پسند مصنفین کے جلسے اور ملا کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی

سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک کے بعد اردو ادب میں حالی اور آزاد کی مساعی جمیلہ سے اردو نظم نگاری کی شروعات ہوئی اور ادب جدید میلانات سے روشناس ہوا۔ اس زمانے میں ایک نئی تحریک جس سے پورا ہندوستان متاثر ہوا، وہ ہے ترقی پسند تحریک۔ ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی ایک انجمن سید سجاد ظہیر نے قائم کی، جس میں نوعمر شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ کہنہ مشق افسانہ نگار شاعر و ادیب شامل ہوئے۔ اس انجمن نے ایک طرف وطنی اور قومی تحریک میں حصہ لیا وہیں سماج کے غریب افراد اور مزدوروں پر بڑھتے ہوئے امراء اور سرمایہ داروں زمینداروں اور تعلق داروں کے نظام کو بھی موضوع بنایا گیا اور سرمایہ دار نظام کے خلاف کھل کر آواز بغاوت بلند کی گئی۔ یہ ترقی پسند مصنفین اور شعراء کی کوششوں کا ثمرہ تھا کہ نظم کے ساتھ غزل کا بھی معیار بلند ہوا۔ ادب میں قومیت اور جمہوریت کو دخل ملا۔ جدید سائنسی علوم اور انگریزی ادب کے اثرات نے شاعری میں گہرائی اور آفاقیت پیدا کی۔

ترقی پسند مصنفین کا پہلا جلسہ ۱۹۳۵ء میں کچھ ہندوستانی طالب علموں نے لندن میں قائم کیا تھا۔ اس

انجمن کا مینی فیسٹو وہیں تیار کیا گیا۔ دستاویز کے اس مسودے کو آخری شکل ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر ملک راج آنند، پرمود سین گپتا، ڈاکٹر دین محمد تاثیر، ڈاکٹر ملک راج آنند، پرمود سین گپتا اور سید سجاد ظہیر نے دی تھی۔(۱)

اس تحریک کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں ۱۹۳۶ء میں ہوئی تھی اس کے صدر منشی پریم چند تھے، اس کانفرنس میں حسرت موہانی، جے پرکاش نارائن، اندر لال باگنگ، یوسف علی میر کملا دیوی چٹو پادھیائے، افتخار الدین اور پنڈت آنند ملا شریک ہوئے، ملا صاحب کے بارے میں سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

''ہماری خوش قسمتی سے وکیلوں کے طبقے میں چند ترقی پسند بھی تھے۔ پنڈت آنند نرائن ملا حالانکہ ترقی پسند ادبی نظریات سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن وہ بھی ایک اچھے شاعر محبّ وطن اور ادب نواز انسان ہیں اور شروع سے ہماری تحریک کے مددگاروں میں تھے اور اس میں شامل تھے، ان کی اور بعض لوگوں کی کوششوں سے رفاہ عام ہال ہمیں مفت مل گیا اور ہماری سب سے بڑی پریشانی دور ہوگئی۔''(۲)

سجاد ظہیر صاحب کے اس بیان کی توثیق ملا کی اس تحریر سے بخوبی ہوتی ہے، جو انہوں نے سجاد ظہیر کے انتقال پر تاثرات کے طور پر قلمبند کئے ہیں ملاحظہ کیجئے:

''سجاد ظہیر کی شخصیت میں ایک جادو تھا، جو لوگوں کو اپنی طرح کھینچ لیتا تھا میں ان سے عمر میں کئی سال بڑا ہوں، لیکن مجھے یاد ہے کہ جب ترقی پسند مصنفین کا پہلا جلسہ رفاہ عام کلب میں ہوا تو وہ مجھے اودھ جیم خانہ کلب سے پکڑ لے گئے تھے۔ ان کے اصرار پر میں نے ایک نظم سنائی، جس کا عنوان تھا ''بیسوا'' یہ نظم اس زمانے میں کہی گئی تھی۔''(۳)

ملا صاحب کے اس بیان سے یہ حیثیت مترشح ہوتی ہے کہ وہ براہ راست نظریاتی طور پر اس تحریک سے کبھی وابستہ نہیں رہے، وہ زمانے کے ساتھ ضرور چلتے تھے لیکن ان کا مقام منفرد تھا اپنی اعتدال پسند فطرت کو برقرار رکھتے ہوئے انہوں نے اندھی تقلید کی راہ کبھی نہیں اپنائی۔

---

(۱) روشنائی سجاد ظہیر ص ۱۱ محبوب المطابع برقی پریس دہلی ۱۹۵۹ء۔
(۲) روشنائی سجاد ظہیر ص ۱۰۲ محبوب المطابع برقی پریس دہلی ۱۹۵۹ء۔
(۳) ماہنامہ گنگ و جمن کانپور سجاد ظہیر نمبر ص ۱۰۔

دہلی میں کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کی گولڈن جبلی کانفرنس ۲۶ر تا ۲۸ر دسمبر ۱۹۸۶ء میں سویت یونین، پاکستان، فرانس، مشرقی جرمنی اور ہندوستان کے نامور ادیب اس تاریخی اجتماع میں شریک ہوئے تھے، اس جشن میں خطاب کرتے ہوئے آنند نرائن ملا نے کہا تھا کہ:

''میرے نزدیک ترقی پسند ادب وہ ہے، جو آنے والے کل کا ادب ہو، جس کی معنویت مستقبل میں بھی قائم رہے۔'' (۱)



اس کانفرنس سے متعلق بلٹز اردو ہفتہ وار ۲۸ر نومبر ۱۹۸۷ء کے شمارے میں ڈاکٹر محمد حسن کا ایک پر مغز مضمون ترقی پسند اردو داں کیا کریں شائع ہوا، جس میں وہ ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

''خیر جو بھی افتتاح فرمایا پنڈت آنند نرائن ملا نے جنہیں سردار جعفری نے یہ کہہ کر متعارف کرایا کہ یہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں شریک تھے اور حاضرین پر یہ اثر پڑا گویا ملا صاحب بھی انجمن کے بانیوں میں سے ہیں۔''

''ملا صاحب جب کھڑے ہوئے تو انہوں نے اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا کہنے لگے میں تو اودھ جم خانہ لکھنؤ میں ٹینس کھیلنے گیا تھا سجاد ظہیر مجھے پکڑ کر لے گئے تھے کہ چلو ایک ادبی جلسہ ہو رہا ہے اس میں شرکت کرلو، ویسے ملا صاحب کا پورا کام اور پوری طرز فکر شاہد ہے کہ ان پر ہمیشہ کانگریسی طرز فکر کا ہی غلبہ رہا ہے اور اس دائرے میں رہ کر وہ جتنے ترقی پسند دشمن ہو سکتے تھے ہوئے اور جتنے ترقی پسند دشمن ہو سکتے تھے رہے۔'' (۲)

اب سے قریب ۵۵ سال قبل پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین خاص کر ڈاکٹر عبادت بریلوی جیسے نقادانِ فن نے ملا پر ترقی پسندی کا لیبل لگانا چاہا تو انہوں نے اس کی کھل کر تردید کی اور انہوں نے نمایاں طور پر سیاسی نظریات اور انسانی نظریات کے درمیان ایک خط کھینچ دیا۔ ملا کا خیال تھا کہ فنکار جب نظریوں کا پابند ہو جاتا ہے تو اس کے فکر کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں اور اس کی قوت تخلیق اپنی معنویت

---

(۱) یوجنا یکم تا ۳۱ر مارچ ۱۹۸۷ء تحریر ارتضٰی کریم ص ۴۱۔

(۲) بلٹز اردو ہفتہ وار ۲۸ر نومبر ۱۹۸۷ء مضمون نگار ڈاکٹر محمد حسن۔

اور حسن کھو دیتی ہے اس کے رشتے بنی نوع انسان سے ٹوٹ جاتے ہیں وہ صرف ایک گروہ رہ جاتے ہیں۔

ملا نے دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی طرح جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کسی نظریہ کا پابند نہیں بنایا اس لئے کہ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے وہ سمجھتے تھے کہ کوئی فنکار عموماً کسی نظریہ کا علمبردار نظام حیات کا پرچارک یا کسی تحریک سے جڑا ہوا انسان کسی دبستان فکر کا نمائندہ سماج یا معاشر کا مصلح نہیں ہوسکتا۔ وہ شدت پسندی، روایت پسندی، اشتراک، تعمیری، رومانی، اصلاحی اور جمالیاتی فکر وتصور سے الگ تھلگ رہ کر ایک سچے اور صالح اور باشعور ادیب کے فرائض سے آگاہ ہوتا ہے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہے، یقیناً ایسے فنکار کم ہیں اور ہر زمانے میں رہا کئے ہیں ایسے مخلص فنکاروں میں ملا بھی ہیں، جو موجودہ دور میں ایک عظیم فنکار کی حیثیت سے منزل انسانیت تک رسائی کے کوشاں ہیں۔

کی مصلحت وقت سے اس نے نہ کبھی صلح

ملا کے سے دوچار ہی دیوانے ملیں گے

اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے فکر وشعور میں جلا بخشی۔ فنکاروں نے تجربات کا حوصلہ دیا۔ خوداعتمادی کا جذبہ بیدار کیا اور روایتی پابندی سے الگ ہٹ کر نئی دنیا خلق کرنے کا حوصلہ اور طاقت دی۔ کلام ملا کے بغائر مطالعہ کے بعد یہ کہنا لازمی سا ہوجاتا ہے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہ ہوکر بھی ملا کے ساتھ ساتھ اردو کے قریب قریب ہر شاعر نے اس تحریک کا براہ اثر نہ سہی لیکن بالواسطہ اثر ضرور قبول کیا۔ مجموعی طور پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملا اپنی پہلی ہی نظم ''پرستار حسن'' محررہ ۱۹۴۷ء سے ہی حسن پرست واقع ہوئے تھے۔ عالمی ادب خصوصاً انگریزی ادب پر نگاہ تھی اس چیز نے ملا کو جدید تقاضوں سے آگاہ کیا۔ ان کے خیالات اور فکر کی گہرائی اور وسعت نگاہ کو دیکھ کر اکثر انہیں ترقی پسند کہنے لگے لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ قدیم تہذیب وتمدن کے خاموش عاشق ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ جدید تقاضوں سے بھی واقف ہیں۔ یہ الگ حقیقت ہے کہ اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک کی

شروعات ہوئی لیکن یہ بات بلاخوف تردید ان کے کلام کے آئینہ میں کہی جا سکتی ہے کہ یہ تحریک نہ شروع ہوتی تو بھی ملا اتنے ہی جدید اور ترقی پسند شاعر ہوتے جیسے تھے۔

# ملا کی قانونی اور منصفی کی خدمات

پچھلے اوراق میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ۱۹۲۵ء میں ملا نے لکھنؤ یونیورسٹی سے قانون کی سند حاصل کی اس کے بعد لکھنؤ ہی میں اپنے آبائی پیشہ وکالت میں لگ گئے اور اپنے والد پنڈت جگت نرائن ملا کے مقابلے میں کچھ بڑھ کر ہی ماہر قانون داں ثابت ہوئے۔ چنانچہ ان کی وکالت اور قانونی حیثیت وخدمات کو دیکھتے ہوئے اگست ۱۹۵۴ء میں انہیں الہ آباد ہائی کورٹ کا جج مقرر کر دیا گیا۔ وہ سات سال دو ماہ ججی کے فرائض انجام دیکر ۲۴ر اکتوبر ۱۹۶۱ء کو اس عہدے سے سبکدوش ہوئے اس کے بعد سینئر جج کی حیثیت سے الہ آباد ہائی کورٹ لکھنؤ بنچ میں خدمات انجام دیں۔ کچھ دنوں بعد ملا سپریم کورٹ دہلی میں سینئر وکیل کی حیثیت سے وکالت کرنے لگے اور یہ سلسلہ تاحیات جاری رہا۔ ان کی تالیف کردہ کتاب سول پروسیجر کوڈ Civil Proceduar Code خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ایک ماہر قانون اور جج کی حیثیت سے ملا صاحب نے ملک کی زبردست خدمت کی ہے، جن کو ملا کی زندگی کو قریب سے سمجھنے کا موقع ملا ہے وہ واقف ہوں گے کہ انہوں نے ہائی کورٹ میں جج کی حیثیت سے ایسے اہم فیصلے کئے ہیں، جن پر عدلیہ بھی ناز کرے گا۔ اس ضمن میں ان کا پولیس کے خلاف فیصلہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے، عدالتی نظام پر ملا کا تبصرہ ملاحظہ کیجئے:

''ہمارے عدالتی نظام میں فوجداری مقدموں میں زیادہ تر بے انصافی ہوتی ہے۔ دیوانی معاملوں میں صرف دیر ہوتی ہے اس دیری کا ذمہ دار وکیل ہے۔ فوجداری میں زیادہ تر بے انصافی کی بنیاد پولیس پر ہے۔ وہ جھوٹے سچے گواہ پیش کرتی ہے پولیس کے خلاف میں نے ایک فیصلہ میں کہا تھا کہ پولیس فورس بے ایمان ہے اس تالاب کی ساری مچھلیاں گندی ہیں۔ کسی ایک مچھلی کو باہر نکال

دینے سے تالاب صاف نہیں ہوگا۔ کوئی اتنا بڑا گروہ نہیں جتنا کہ پولیس۔ مجرم بھی چھٹیاں کرتے ہیں مگر پولیس کی کوئی چھٹی نہیں۔ وہ دن رات جرم کرتے رہتے ہیں یوپی کی حکومت نے کہا کہ میں نے اپنے فیصلے میں پولیس کے خلاف جو ریمارک لکھے ہیں ان کو نکال دیا جائے اور آخر میں سپریم کورٹ نے یہ کہہ کر کہ ان جملوں کی کوئی ضرورت نہیں ان کو میرے فیصلے سے نکال دیا۔''(۱)

غور طلب امر یہ ہے کہ پولیس کی نااہلی کو دیکھتے ہوئے ملا نے اس کے خلاف جو ریمارکس دیے اسے سپریم کورٹ نے اپنی برتری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نامناسب سمجھ کر کالعدم قرار دے دیا حالانکہ موجودہ دور میں پولیس ریمارکس کا عکس آج کے ماحول میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ پولیس کی ظلم وزیادتی، جھوٹ اور رشوت کی ہزاروں گواہیاں مل سکتی ہیں۔ انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر جھوٹ کو جھوٹ اور سچ کو سچ کہنے والے منصف کے حق پر مبنی ریمارکس کو خارج کر کے نہ صرف یہ کہ انصاف کا خون کرتے ہیں بلکہ اس نے ہندوستان کے عدلیہ پر بے اعتباری کی ایک مہر ثبت کردی ہے۔ ملا صاحب اپنے عدالتی منصب سے سبکدوش ہوئے تو انہوں نے اپنے کام کا جائزہ نہایت دلپذیر طور پر بیان کیا ہے، ملاحظہ کیجئے:

یہ ہمت مردانہ پھر آئے کہ نہ آئے
مجھ سا کوئی پروانہ پھر آئے کہ نہ آئے
طاقت کی رعونت کے مقابل بہ لب عدل
یوں حرف حریفانہ پھر آئے کہ نہ آئے
قانون کی آواز میں نغمے کی کھنک سی
یہ ساز حکیمانہ پھر آئے کہ نہ آئے
مسند پہ پہونچ کر بھی رہا حامی جمہور
ملا کا سا دیوانہ پھر آئے کہ نہ آئے

---

(۱) آنندنرائن ملا سے انٹرویو از خالد ہندی ہما جولائی ۱۹۶۹ء ص ۱۶۔

عام مشاہدہ ہے کہ آج کے جمہوری دور میں اقتدار کی کرسی پر براجمان ہوکر ہمارے جمہوری لیڈر کس طرح بے باکانہ جمہوریت کا مذاق اڑاتے ہیں اور اپنی انانیت کا بین ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اسی صورت حال کے خلاف ملا کا یہ شعر ان کے منہ پر بھرپور طمانچہ ہے۔ حامی جمہوریہ سے ملا کی مراد مظلوم اور دبے کچلے مزدور بھی ہوسکتے ہیں۔ ملا کا یہ ناقابل فراموش کارنامہ ہے کہ جج کے منصب پر فائز ہوکر بھی ملا نے مظلوموں کو انصاف دیا ہے حکومت کی لغت میں قانون کی تعریف بزبانی ملا صاحب ملاحظہ کیجئے:

یہ حق کا تحفظ ہے نہ آئین کا اجارا
مجرم کیلئے قہر نہ بے کس کا سہارا
قانون کی تعریف حکومت کی لغت میں
طاقت کے نشے میں کوئی بہکا سا اشارا

# ملا کی سیاسی خدمات

پارلیمنٹ کے ایک رکن کی حیثیت سے ملا صاحب کی متعدد خدمات لائق ذکر ہیں:

(۱) ۱۹۶۷ء میں لکھنؤ کے حلقے سے لوک سبھا کیلئے آزاد امیدوار کی حیثیت سے ملا منتخب ہوئے۔

(۲) انہوں نے کانگریس پارٹی میں اس وقت شمولیت اختیار کی، جب ۱۹۶۹ء میں پارٹی میں شگاف پڑنے لگا تھا اور جناب مرارجی دیسائی کابینہ سے برطرف کردئے گئے تھے۔

(۳) ۱۹۷۲ء میں کانگریس پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے ملا راجیہ سبھا کے ممبر منتخب ہوئے اور چھ سال بعد ۱۹۷۸ء میں سبکدوش ہوئے۔

(۴) مختلف پارلیمانی کمیٹیوں کے صدر (چیئرمین) نامزد کئے گئے، جن میں Prestigeous Land Acquisition Reviver Committee بھی شامل ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی رپورٹ پیش کی۔

(۵) آزاد رکن کی حیثیت سے Criminal Procedures Amendment مجرمانہ ضابطہ ترمیمی مسودہ قانون پیش کیا، جس کی رو سے عدالتی فیصلے عائد کردئے، یہ بل حکومت نے قبول کیا اور اتفاق رائے سے منظور ہوا۔

(۶) ملا صاحب نے ایک پارلیمانی رکن کی حیثیت سے حکومت کے سامنے کئی تجاویز پیش کیں، جنہیں حکومت نے ان تجاویز کو غور کرنے کے بعد منظور کرلیں اوراب جو Criminal Procedure Code ہے اسی حصہ کی ایک شکل ہے۔

ایک پارلیمانی کی حیثیت سے ملا صاحب کی سیاسی خدمات کا یہ اجمالی جائزہ ہے۔

# ملا صاحب کی سماجی خدمات

(۱) ملا صاحب ۱۹۴۶ء میں ہندو پاک کمیشن کے صدر منتخب ہوئے انہوں نے اس کام کو چھ سال یعنی ۱۹۵۲ء میں مکمل کیا۔

(۲) کیرالا کی حکومت کی طرف One Man Commission کے صدر مقرر ہوئے اس کمیشن کے تحت تین وزیروں کے خلاف بدعنوانیوں کے جرم میں شامل ہونے کی تفتیش کرنی تھی، ملا کی پیش کی ہوئی رپورٹ منظور کرلی گئی۔

(۳) مغربی بنگال کمیونسٹ پارٹی کی طرف کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے، اس میں ۱۹۶۶ء کی حکومت کے غلط کاموں پر نظر ڈالنی تھی، ملا کی تیار کردہ کمیشن رپورٹ کو منظوری ملی۔

(۴) ملا صاحب ۱۹۸۰ء میں جیل ریفارم کمیشن Jail Reform Commission کے چیئرمین مقرر ہوئے ۱۹۸۳ء میں ملا نے رپورٹ داخل کی۔ ملا صاحب گونا گوں شخصیت کے مالک ہونے کے ساتھ نہایت مدبر اور ماہر قانون بھی تھے۔ انہیں صلاحیتوں کو دیکھ کر انہیں ہند پاک کمیشن کا صدر بنایا گیا تھا یہ نہایت اہم اور ذمہ داری کا کام تھا اس میں ان کو ہندو پاک فوجیوں کی پنشن اور

دوسرے مسائل سلجھاتا تھے۔ ملا نے اسے بھی اپنی فطری سوجھ بوجھ سے اور انسانی تقاضوں کو ملاحظہ کرتے ہوئے حل کر دیا۔

ملا کی سماجی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت کیرالا کی طرف چیئر مین مقرر کیا جانا ہی کافی ہے اور جیل سدھار کیلئے ملا کے لئے دیے گئے مشورے سے ملا کی نگاہ دور رس اور معاملہ فہمی حق گوئی پاک باطنی انصاف پسندی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

# Mulla as a Party man

# (جماعتی فرد کی حیثیت) سے ملا کی خدمات

(۱) ۱۹۷۷ سے ۱۹۸۰ کے مابین اندرا گاندھی نے ملا صاحب کو اپنے مقدمات میں مدد اور صلاح ومشورے کے لئے مقرر کیا تھا۔ وہ زمانہ کانگریس اور اندرا گاندھی دونوں کیلئے نہایت نازک اور تاریک دور تھا۔ ان حالات میں اپنے وزیراعظم کو کیسی کیسی ہوشربا مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ ذرا سی سیاسی سوجھ بوجھ والا شخص بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے ان حالات میں انہوں نے اندرا گاندھی کو جتنے مفید مشورے ہو سکتے تھے، دیے ہوں گے اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ملا صاحب اندرا گاندھی کے نزدیک لائق اعتماد (Man of good Faith) آدمی تھے۔

(۲) اسی طرح جب کانگریس سے اس کا انتخابی نشان ''دو بیلوں کی جوڑی'' چھن گیا تھا اس وقت ملا صاحب نے الیکشن کمیشن سے مقدمہ لڑکر ہاتھ کا پنجہ انتخاب نشان حاصل کیا تھا۔ یہ ایسا Symbolic چناؤ تھا کہ اسی نشان سے الیکشن لڑکر ۱۹۸۰ میں اندرا گاندھی دوبارہ اقتدار میں آئی تھیں۔ کانگریس کے حق میں ملا صاحب کی یہ زبردست خدمت تھی۔

(۳) ایک اندرا گاندھی کیا پورے نہرو خاندان کو ملا صاحب کی قانونی گرفت پر پورا بھروسا

ہونے کا یہ ثبوت تھا اس کا اندازہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں مرحوم سنجے گاندھی کیلئے ملا صاحب ہی وکیل مقرر ہوئے تھے۔

(۴) ۱۹۸۶ء اور مابعد بھی Legal Cell میں چیئر مین کی حیثیت سے ملا نے خدمات انجام دیں۔

(۵) ملا نے وزیراعظم کے قومی راحت فنڈ National Relief Fund میں قریب ایک لاکھ روپیہ کا مالی تعاون دیا تھا۔

غرضکہ بحیثیت وکیل، جج، ماہر قانون اور قانونی صلاح کار ملا صاحب کی صلاحیتوں اور خدمات کا اعتراف نہ صرف عوام الناس نے بلکہ وزیراعظم ہند محترمہ اندرا گاندھی نے بھی کیا تھا۔ اس طرح قانون کی دنیا میں ملا صاحب کی خدمات کبھی بھلائی نہیں جاسکتی ہیں۔

ضعیفی خود ہی ایک بڑا بلکہ مہلک مرض ہے اس کے آ جانے کے بعد پھر کوئی ایسی منزل حیات سامنے نہیں رہ جاتی، جس میں رمق حیات نظر آ سکے۔ موت ہی زندگی کا آخری پڑاؤ ہے، زندگی یقینی نہیں بلکہ موت یقینی ہے، بقول رواں اناوی:

رواں سوائے اجل اس جہان فانی میں
نہیں ہے اور کوئی شے یقین کے قابل

ملا اپنی عمر عزیز کے ۹۶ سال پورے کر چکے ہی تھے۔ انہوں نے بیسویں صدی کے ہر رنگ خوشگوار یا ناگوار کو دیکھا پرکھا اور برتا کشمیریوں میں ہمت وحوصلہ اور علمی خدمات کا خصوصی وصف ملا میں تمام وکمال موجود تھا۔ انہوں نے تاریخ اردو ادب میں مستقل جگہ بنائی غیر مسلم ادیبوں نے اردو زبان وادب کی تعمیر وتشکیل بہبود وبقا کے لئے جو عظیم خدمات انجام دی ہیں من حیث القوم شاید ہی کسی کو ان کا ہم پلہ کہا جا سکے، آخر کار وہ منزل آ ہی گئی، جس سے ہر ایک کو گزرنا ہے، تھوڑے دن طبیعت زیادہ نڈھال رہی آخر کار یہ بولتا ہوا مجاہد اردو ۱۹۹۷ء میں ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گیا۔ فگار اناوی نے تاریخ وفات کہہ کر حق عقیدت ادا کیا۔

اف فگار اف یہ پرستار زبان اردو
آج دانش کدہ علم وادب سے اٹھا
لکھ دے یہ مصرعہ تاریخ وفات آہ کے ساتھ
چل بسے حضرت آنند نرائن ملا

۱۹۹۷ء=۱۹۹۱+۶

ملا کی شخصیت پر منظوم خراج عقیدت پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے یہ کہہ کر پیش کیا ہے:

ہے زبان لکھنؤ میں حسن معنیٰ کی بہار
واقعی ملا نے پیدا کی نئی راہ سخن

حیثیت سے جج کی ان کے عدل کی کبھی دھوم تھی
لکھنؤ کو شعر نے ان کے دیا اک تازہ فن
ان کے خطبوں میں بھی جرأت کی فراوانی کے ساتھ
منضبط دیکھا گیا ہے ہوش او ردیوانہ پن
جرأت رندانہ ان کے لئے تعصب کیوں نہ ہو
ان کا ملا نام ہے اور ذات ان کی برہمن

ضیاء ہانی صاحب کا خراج عقیدت ملاحظہ کیجئے:

اے فدائے حسن اردو اے پرستار زباں
اے امیر کارواں اے شاعر شیریں بیاں
تیری خدمات مسلسل تیرے افکار جمیل
اہل اردو کے لئے ہیں اک چراغ رہ گذر
جلوہ گل دیکھتا ہے تو حجاب اندر حجاب
کس قدر گہری ہے تیری کاوش فکرونظر
ہے تری آواز میں سوزوگداز و کائنات
ہے تری فکروسخن میں اجتہادی کروفر
تیرے احسانات تابندہ رہیں گے حشر تک
تیری تخلیقات کو مانا گیا ہے معتبر
تیرے جذبات درخشاں کی نہیں ملتی مثال
تیرے نغمات محبت ہیں بڑے جادواثر
چھا گیا سارے زمانے پر ترا حسن کلام
ماند ہے اس کی چمک سے جلوہ شمس وقمر

تیرے عملی کام سے اے نیک دل اے نیک نام
کاش اردو کو ملے کھویا ہوا اپنا مقام

نشورواحدی نے یہ منظوم خراج عقیدت پیش کیا تھا:

وہ دور ادب کوئی ہو تابندہ ہیں ملا
تہذیب و ثقافت کے نمائندہ ہیں ملا
اس گلشن اختر کو سجایا ہے انہیں نے
نغمہ نئے انداز کا گایا ہے انہیں نے
جب بزم ادب گیسوئے بیچاں کی طرح تھی
جب شاعری اک پیکر بے جاں کی طرح تھی
ملا نے دھڑکتا ہوا دل اس کو دیا ہے
جس سائے میں لے سانس وہ ظل اس کو دیا ہے
ہمسر نہیں اس رنگ عوامی میں کوئی اور
ملا نہیں بولے ہے تغزل کا نیا دور
اس لکھنؤ کو خون دیا تازہ روی کا
تب جاکے ہوا شہر نگاراں کا یہ نقشا
ہر نقطہ میں احساس ہے سوجان کا جیسے
ہر لفظ میں دھڑکے ہے دل انسان کا جیسے
کشمیر کے چشموں کی جھلک ان میں ملے گی
کشمیر کے پھولوں کی مہک ان میں ملے گی

تعمیر کی منزل کا شناسا نہیں کوئی
پنڈت بھی ہو ملا بھی ہو ایسا نہیں کوئی
فن کاری وتجدید کے ساقی ہیں یہی لوگ
کچھ صفحہ وقرطاس پہ باقی ہیں یہی لوگ
کیا چیز ہے انساں یہ وہی جان سکے ہیں
انسان کو ہر شکل میں پہچان سکے ہیں
یہ بام وہ ہے جس کا کہ زینہ بھی جدا ہے
ہر شخص کی خدمت کا قرینہ بھی جدا ہے
اردو کو کٹھن وقت میں ملا نے بچایا
اردو کو ہمالہ کی بلندی پہ بٹھایا
خلاق افکار کے ملا ہی ہیں والی
چکبست کی مسند کبھی رہتی نہیں خالی
ملا کو نہ بھولو یہ سمجھنا ہے بڑی بات
گو اہل سیاست کے لئے ہے یہ کڑی بات

# باب دوم

# ملا کے عہد کا تہذیبی، سماجی، سیاسی اور ادبی جائزہ

لکھنؤ میں شعر وشاعری کی بزم آراستہ ہونے سے پہلے دو مجالس قائم ہو کر مٹ چکی تھیں، پہلی بزم یا مجلس دکن کی تھی اور دوسری شمالی ہند یا دہلی کی متقدمین شعرائے دہلی نے جذبات کے خلوص وصداقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کی شاعری کی خوبی کا دار ومدار لفظی گورکھ دھندوں پر نہیں بلکہ جذبات کی ٹھوس اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ ان کی شاعری داخلی اور قلبی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے یہاں روحانی مضامین اور وجدانی کیفیات کی کثرت ہے، جن کے بیان میں انہوں نے حسن کے اثر کو بیان کیا اور خارجی متعلقات حسن کی محبت سے دامن بچائے رکھا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ متقدمین دہلی نے دکن والوں کے مقابلے میں تشبیہ واستعارے سے کام لیا لیکن اعتدال کو فراموش نہیں کیا اور تخیل کی پرواز میں انہوں نے فطرت اور حقیقت کو نہیں بھلایا۔ ان لوگوں نے اردو شاعری میں ایک نیا مضمون رائج کیا، جو دکنی شعراء کے یہاں نہیں ہے وہ ہے تصوف۔ دکن میں چونکہ سلاطین کے زیر سایہ شاعری نے پرورش پائی تھی دکنی شعراء زیادہ تر اثنا عشری عقیدہ رکھتے تھے اس لئے ان لوگوں نے سلاطین صفی کے زیر اثر اس طرف رخ نہیں کیا۔ برخلاف اس کے متاثرین شعرائے دہلی نے اپنے مذاق کے مطابق زبان میں تراش خراش کی اور محاورے کو ایسا درست کیا کہ اب تک اس میں بہت کم فرق آیا ہے۔ لیکن ان کے خیالات منتشر ہونے لگے اور جذبات عشق میں عشق حقیقی اور پاک الفت کے خیالات کی جگہ ہوس پرستی کے جذبات نظم کئے جانے لگے۔ اس کی ابتدا جرأت، انشاء اور رنگین نے کی تھی اور چونکہ شعراء آنے والے دور کے شعراء کیلئے نمونہ تقلید تھے، اس لئے جو زہر ان لوگوں نے گھولا تھا وہ شعر وادب کے جسم میں سرایت کرنے لگا۔ ان ہی لوگوں نے ریختہ کے ساتھ ریختی کو بھی

ترقی دی۔ حالانکہ دکن میں ریختی کہنے والوں کی دو مثالیں ہیں لیکن یہ ہندی شاعری کا نمونہ ہیں اس لئے اردو میں اس کی مثال نظر نہیں آتی۔ ان میں بھی وہ بے شرمی اور ہوسنا کی نہیں، جو رنگین اور انشاء سے شروع ہوئی اور بعد میں لکھنؤ پہونچ کر فن بن گئی۔ دہلی کی فضا میں خزاں کے بادل منڈلاتے رہے تھے پھر بھی یہ عمارت کمزور بنیادوں پر بھی بڑی شان سے قائم تھی۔ اچانک ملک میں چاروں طرف سورش برپا ہوگئی پنجاب میں جاٹوں نے دکن میں مرہٹوں اور روہیلوں حکومت کی چولیں ہلادی تھیں سارا دربار درہم برہم ہوگیا۔ چنانچہ اہل دربار محفوظ و مامون جگہ کی فکر میں مرشد آباد، عظیم آباد، حیدرآباد کی طرف مراجعت کر گئے اور بہت سے فرخ آباد اور فیض آباد میں جا کر بس گئے۔ فرخ آباد کی اسلامی حکومت تھوڑے ہے دنوں تک ان مہاجرین کا ساتھ نباہ سکی۔ اب ان لوگوں کی نگاہ میں فیض آباد لکھنؤ رہ گیا تھا، جہاں انہیں پناہ مل سکتی تھی چنانچہ انہیں مہاجرین شعراء کی بدولت اردو شاعری کی تیسری مجلس اودھ کی سرزمین پر قائم ہوئی۔ یہی دبستان شاعری لکھنؤ دبسان شعر ہے، جو اپنی گوناں گوں صفات کے لحاظ سے مذکور الصدر دونوں دبستانوں سے الگ تھلگ رنگ کا حامل ہے، اس سلسلے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

''نواب سعادت علی خاں برہان الملک امین الدولہ نیشاپوری کو ان کی خدمات کے صلے میں اودھ کی صوبیداری عطا ہوئی تھی، لیکن برہان الملک نے دہلی کے دربار کا نقشہ دیکھ کر پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ اگر اپنے صوبے کی خیر منظور ہے تو اپنے ہی پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ وہ ان کے جانشین دلی کے دربار سے آزاد ہوتے گئے۔ اگرچہ عرصہ تک فرمانروان اودھ نے نواب وزیر کے لقب پر قناعت کی اور دلی کے شاہان شطرنج کے نئے وزیر کے لئے خلعت اور خطاب بھیجا کرتے تھے لیکن انگریزوں نے بعض سیاسی مصالح کی بنا پر یہی بہتر سمجھا کہ نواب غازی الدین حیدر اج شاہی زیب فرمائیں اسی دن سے لکھنؤ کا دربار گویا شاہی دربار ہوگیا اور دلی کا مقابلہ کرنے لگا۔'' (۱)

تاریخ فرح بخش کے مصنف کا کہنا ہے کہ:

---

(۱) لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۴۳ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ ۱۹۹۱ء۔

''اگر کچھ برس اور فیض آباد کی آبادی کو گذرتے تو ایک دوسرا شاہجہاں آباد وجود میں آجاتا۔ لیکن نواب شجاع الدولہ نے فیض آباد کو اجاڑ کر لکھنؤ بسایا۔ اہل فضل وکمال کا جو سیلاب اب تک فیض آباد کی طرف آرہا تھا لکھنؤ کی طرف امنڈ پڑا۔ فیض آباد میں بھی شعرائے دہلی میں آرزو اور ضاحک آچکے تھے۔ لکھنؤ دارالسلطنت ہوا تو ضاحک کے بیٹے میر حسن اور ان کے پوتے میر مستحسن خلیق بھی آگئے، میر سوز، مرزا رفیع سودا اور میر تقی میر، غلام ہمدانی، مصحفی، میر انشاءاللہ خاں انشاء، شیخ قلندر بخش جرأت بھی آگئے۔ پرانے شاعر تو مرکھپ گئے، البتہ نوجوانوں نے میدان خالی پاکر اپنا رنگ کھل کر کھیلا۔ دل کی شاعری اپنے دور آخر میں جس طرف انشاء، جرأت، رنگین کی بدولت جارہی تھی وہاں سے لکھنؤ شاعری کی ابتدا ہوئی اور چونکہ بنیاد کج تھی اس لئے عمارت آخر تک کج ہی چلی گئی۔''(۱)

لکھنؤ کی شاعری پر سب سے پہلا اثر لکھنؤ کی معاشرت کا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جسے سحر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو
ہراک گھر خانہ شادی ہراک کوچہ ہے عشرت کا(۲)

دولت کی فراوانی اور فضا نے تعیش اور آزادی کی راہ دکھائی تماش بینی پر لوگ فخر کرنے لگے، چنانچہ یہاں کے ابتدائی شعروادب کا سرمایہ بھی اسی میلان کا آئینہ دار ہے۔ جذبات کی پاکیزگی اور بیان کی متانت وسنجیدگی جو دہلوی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے لکھنؤ میں مفقود تھا اور اس کی جگہ ایک نئے فن نے جسے معاملہ بندی کا نام دیا گیا تھا، لے لی تھی۔ یہ کہنا اپنی جگہ درست ہے کہ اس معاملہ میں جرات کا پلہ سب سے بھاری نظر آتا ہے وہ دہلوی تھے۔ اس میں لکھنؤ کا کیا مذکور۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس فضائے لکھنؤ میں ان کی تسکین کے سامان موجود تھے۔ چنانچہ یہاں کے ماحول اور فضا میں ان کو یہ موقع ہاتھ لگا کہ اپنے فطری جذبات اور میلانات کو اپنے من پسند ڈھنگ سے نظم کریں اور خراج تحسین حاصل کریں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

---

(۱) تاریخ فرح بخش از فیض بخش۔
(۲) گل رعنا عبدالحئی ص ۳۹۰۔

کل واقف راز اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات
جرأت کے یہاں رات جو مہمان گئے ہم
کیا جانئے کم بخت نے کیا ہم پہ کیا سحر
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

(جرأت)

رات کو چوری چھپے جو پہونچا میں
غل مچایا اس نے دوڑو چور ہے

(ناسخ)

ہاتھ میں انگیا کی چڑیا آگئی
آج ہم عنقا کو لائے ہیں دام میں

(مسیح)

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت
ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی، رات کے وقت

(انشاء)

مستی میں لگا ہی چکا تھا اسے گلے
بہکا جو پاؤں ہاتھ کمر سے نکل گیا

(امانت)(۱)

اس معاملہ بندی کے ساتھ ساتھ قدرتی طور پر شعر کی ہر صنف میں رکاکت اور ابتذال سرایت کر گئے تھے۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

---

(۱) گل رعنا عبدالحئی ص ۱۷۰(امانت کی غزل گوئی پر ایک نظر از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مطبوعہ جامعہ جنوری ۱۹۴۱ء مشمولہ لکھنؤ کا دبستان شاعری۔

''اگر اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو انیس، دبیر اور محسن کاکوری نہ روکتے تو معلوم نہیں شاعری کا کیا حال ہوتا۔''(۱)

اسی سلسلے میں نسائیت کا عنصر بھی شعروادب کا جزوخاص بن گیا۔ ہندی شاعری میں جذبات کی آگ کو ہوا دینے کیلئے عشق کا اظہار عورت کی طرف سے کیا جاتا ہے اسی کی تقلید میں ہمارے متقدمین شعرائے اپنی داستان عشق عورتوں کی آڑلیکران کی زبان میں بیان کی ہیں، افضل کا بارہ ماسہ ( بکٹ کہانی ) اس کی بہترین مثال ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ابواللیث نے بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، مختصراً ملاحظہ کیجئے:

''شجاع الدولہ کے عہد سے حسین اور مہ جبیں عورتوں کو سوسائٹی میں بڑا دخل ہوا۔ ادھر عیش وعشرت اور فراغت نے مردانہ جذبات اور خیالات کو کمزور کیا نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں کے جذبات وخیالات اور زبان پر نسائیت غالب آ گئی۔ ریختہ کے جواب میں ریختی کو ترقی دیکر بے حیائی کی داستانیں بے شرمی سے نظم کی جانے لگیں۔ ریختی کے ان نمونوں میں عورتوں کے جن جذبات کو ان کی زبان میں ان شاعروں نے نظم کیا ہے وہ لکھنؤ کی سوسائٹی پر داغ بن کر قائم ہیں۔ نسائیت کا اثر صرف ریختی کی صورت میں ظاہر نہ ہوا عام خیالات زبان اور محاورے میں نسائیت آ گئی۔''(۲)

اسی لکھنوی فضا کا ایک اہم رخ آزادی تھا، نواب وزیر نے دلی کے دربار سے آزادی کیا حاصل کی کہ اہل لکھنؤ نے ہر چیز میں خودکو آزاد کرلیا۔ تہذیب وتمدن اور معاشرت کے نئے اصول بنائے گئے۔ لباس، وضع قطع میں نئی نئی تراشیں پیدا کی گئیں، آداب محفل اور انداز گفتگو بدلے چنانچہ شاعروادیب بھی شاعری کے مروجہ اصولوں اور اسالیب سے انحراف کرنے لگے۔ پہلے شاعری جذباتی اور داخلی تھی تو اب اس نئے رنگ میں رنگ کر لفظی اور خارجی ہوگئی۔ دہلوی رنگ شاعری فطری تھا تو اب لکھنؤ میں کمال صنعت معیار شعر ٹھہرا۔ دلی میں سادگی اور برجستگی تھی یہاں تصنع اور تکلف داخل ہوا، زبان میں ایسی تراش خراش پیدا کی گئی جو پہلے کبھی نہیں تھی۔ اس آزادی کا تاریک پہلو یہ تھا کہ اثر جو متقدمین شعرائے دکن ودلی کے کلام کو ممتاز کرتا ہے رفتہ رفتہ کم

(۱) لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۷۴ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نسیم بکڈ پو لاٹوش روڈ لکھنؤ ۱۹۹۱۔
(۲) لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۴۶ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نسیم بکڈ پو لاٹوش روڈ، لکھنؤ ۱۹۹۱ء۔

ہونے لگے۔ لیکن اس کا روشن پہلو صفائی زبان کی کوشش تھی۔ اس سلسلے میں شعرائے دہلی نے جو کوششیں کی تھیں اہل لکھنؤ نے انہیں نہ صرف یہ کہ جاری رکھا بلکہ اسے خاص صورت بخشی۔ مثلاً تذکیر وتانیث کے اصول با قاعدہ طور پر منضبط نہیں ہوئے تھے ناسخ نے بڑی محنت صرف کر کے اور اس کی سختی سے پابندی کر کے متعین کئے۔ زبان کی صفائی کے سلسلے میں لکھنؤ کا کارنامہ اردو تاریخ میں ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔

آزادی کے علاوہ لکھنؤ کی فضا کا ایک اہم عنصر تکلف تھا۔ تمدن کی بنیاد تکلف بناوٹ اور تصنع پر رکھی گئی تھی اسی وجہ سے آج تک لکھنوی حضرات اپنے تکلف کے لئے شہرت پذیر ہیں۔ شعروادب میں بھی تکلف ان کے ماحول کی ترجمانی کرتا ہے، جس کی واضح مثال رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب سے ملتی ہے، سروش سخن کی عبارت نہایت پرتکلف اور بے شمار صنائع لفظی ومعنوی سے گرانبار ہے۔ یہی حال شعر کا ہے لکھنوی شعراء نے شعر کے ظاہری پیکر پر زیادہ توجہ صرف کی ہے اور اس اعتبار سے ان کے اشعار نہایت مرصع اور آب دار ہیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے نہایت مدلل بات کہی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''حضرت امیر خسرو اور بیدل جیسے عظیم المرتبت شعراء نے بھی اپنی شاعری میں باوجود اپنی جدت طبع کے فارسی (ایرانی) شعراء کے نظریہ شاعری میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اردو اسی وقت بچپن کی حالت میں تھی، اور اس صنعت گری کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ اردو ابھی ایسا بچہ تھی، جس کی زبان صاف نہیں ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ متقدمین شعرائے دکھن کی شاعری جذباتی اور فطری ہے۔ متقدمین شعرائے دہلی جن کے یہاں دلی کی آمد کے وقت بیدل کی فارسی شاعری کا انداز مقبول تھا۔ شعر گوئی شروع کی تو ایہام گوئی اور تجنس سے شروع کی دلی والوں نے پہلے پہل خود اس کے خلاف جدوجہد کی۔'' (۱)

اس کے بعد شاعری جب لکھنؤ پہونچی یہاں اس وقت تہذیب وتمدن پر تکلف اور تصنع کا رنگ چڑھ رہا تھا ادھر زبان میں وسعت پیدا ہوچکی تھی اس لئے شاعری میں اس جدید رنگ کو پیش کرنے کی اس سے بہتر اور کوئی صورت نہیں تھی کہ اسے صنعت گری بنا دیا جائے۔

(۱) لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۴۸ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نسیم بکڈ پو لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔

ویسے تو ہندوستان میں سیاسی اور قومی بیداری کی شروعات بہت پہلے ہی ہو چکی تھی اور اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک، وہابی تحریک، فرائضی تحریک، راجہ رام موہن رائے اور کیشپ چند کی تحریکیں۔ سرسید کی علی گڑھ تحریک اور بعض دوسری تحریکوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس تیزی سے ہندوستانی ذہن بدیسی اور بیرونی تسلط سے عہدہ برآ ہونے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ لارڈ میکالے نے ہندوستانیوں کیلئے جو نیا نظام تعلیم نافذ کیا تھا اس نے ہندوستانیوں کے حق میں مفید سمت کی طرف رہنمائی کی۔ برطانوی نظام تعلیم کو ہندوستانیوں پر اسی لئے لاگو کیا گیا تھا کہ حکومت کا سارا نظام نہایت آسانی سے چلایا جا سکے اور دھیرے دھیرے ایسی تہذیب کی تخم ریزی کی جائے، جس سے ان کے تہذیبی تسلط کو استحکام مل سکے۔ لیکن نئی انگریزی تعلیم جمہوری خیالات کی راہیں استوار کر دیں۔ مغربی تعلیم حاصل کر کے وکیل، ڈاکٹر، استاد اور دوسرے انتظامی کام کر سکنے والے پیدا ہو رہے تھے اور انیسویں صدی میں جمہوریت اور شہری حقوق کے جو تصورات رائج تھے، وہ ان کا مطالبہ کر رہے تھے، ہندوستان کے بدلتے ہوئے ذہن نے قومیت کے جدید تصور کی تشکیل کر لی تھی اور لوگوں کے دلوں میں بیرونی اقتدار کا تسلط ان میں معاشی اور تہذیبی استحصال کا شعور پیدا ہونے لگا تھا۔ ۱۸۸۳ء میں انڈین ایسوسی ایشن کلکتہ نے پورے ملک کی ایک کانفرنس کی جس کی صدارت آنند موہن بوس نے کی تھی۔ دو سال بعد انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی۔ رجنی پام دت نے اپنی کتاب انڈیا ٹوڈے میں کھل کر یہ بتایا ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد مسٹر ہیوم نے اس لئے ڈالی تھی کہ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں قومی بیداری کی لہر اٹھ رہی ہے اور پورے ملک میں جو ترقی پسند عناصر بڑھ رہے ہیں ان کا مل جانا فطری امر ہے اسی لئے اس دھارے کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھنا ضروری ہے دراصل کانگریس کا قیام جنرل ہیوم کی زبردست چال تھی۔

ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک میں پہلے ہی دن سے دو الگ الگ رائیں تھیں۔ ایک گروہ ایسا تھا، جو صلح اور آشتی کے ساتھ اپنے مطالبات سرکار کے سامنے رکھنا چاہتا تھا لیکن دوسرا گروہ نہایت جوش و خروش اور ان کے باغیانہ جذبے اور سرکشی کا نمائندہ تھا اس کا ماننا تھا کہ ''حق چھین لیا کرتے ہیں مانگا نہیں

کرتے'' بیسویں صدی میں اس گرم دل کی رہنما آربندوگھوش، وپن چندر پال، لالہ لاجپت رائے تھے اور ان کے سربراہ بال گنگا دھر تلک، یہ لوگ اعتدال پسندوں کے مقابلے میں انتہا پسند کہے جاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم لوگوں کو جلد از جلد انگریزوں سے سمجھوتے اور دوستی کی پالیسی چھوڑ کر فیصلہ کن جنگ لڑنی چاہئے۔ ۱۹۰۸ء میں تلک کو گرفتار کر کے مانڈے (برما) میں چھ سال قید میں رکھا گیا اور پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے شروع ہونے تک وہ وہاں قید رہے۔ تلک کی گرفتاری نے جلتی آگ پر پٹرول کا کام کیا ان کی گرفتاری پر بمبئی کے کپڑا کارخانوں میں زبردست ہڑتال کی تین سال کے عرصہ میں صرف بنگال کی عدالتوں میں ساڑھے پانچ سو مقدمے پیش ہوئے۔ حالانکہ پولیس نے نہایت بے دردی سے اس ہڑتال یا بغاوت کو کچلا، جگہ جگہ اسکولوں میں قومی ترانے گائے جانے لگے اور طالب علموں کو اس جرم میں قید کیا جانے لگا۔ کچھ دنوں کے لئے یہ تحریک ضرور دب گئی لیکن اس میں ذرا بھی شک کا شائبہ نہیں ہے کہ ہندوستان کی مکمل آزادی کے مطالبہ کا بیج پڑ گیا تھا۔ اس ضمن میں خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں کانگریس میں اعتدال پسندوں نے حکومت برطانیہ سے تعاون اور وفاداری کا منصوبہ تیار کیا اس زمانے میں کانگریس کے جو چار سالانہ جلسے ہوئے ان چاروں میں حکومت سے تعاون اور جنگ کی تائید میں تجویزیں منظور کی گئیں۔ ۱۹۱۸ء میں جنگ کے اختتام پر دہلی میں کانگریس کا جلسہ ہوا، جس میں حکومت کو کامیابی کی مبارکباد دی گئی۔ گاندھی جی نے وائسرائے کو خط لکھا اور اظہار مسرت کیا۔ گاندھی جی کو یقین تھا کہ اس رویے سے برطانوی حکمرانوں کا رویہ ہندوستانیوں کی طرف سے بدل جائے گا۔ لیکن ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس صورت حال کا زبردست ردعمل ہوا۔ چنانچہ ہر طرف ہڑتالیں ہونے لگیں اور مزدوروں اور کارخانوں میں کام کرنے والوں کا طبقہ ایک بار پھر سر اٹھانے لگا۔ دسمبر ۱۹۱۸ء میں بمبئی کے سوتی کارخانوں میں ہڑتال شروع ہوئی اور ۱۹۱۹ء جنوری تک صرف چھ ماہ کی مدت میں سوا لاکھ مزدور شریک ہوئے۔ ۱۹۲۰ء کے چھ مہینوں میں تقریباً دو سو ہڑتالیں ہوئیں، جن میں پندرہ لاکھ مزدوروں نے حصہ لیا۔''(۱)

(۱) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ص ۳۳ خلیل الرحمٰن اعظمی ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۰۲ بحوالہ انڈیا ٹوڈے ص ۵۰۵ رجنی پام دت۔

۱۹۲۰ء میں کانگریس کے اجلاس کی صدارت لالہ لاجپت رائے نے کی، جس میں انہوں نے کہا:

''اس حقیقت سے آنکھ چرانے سے کوئی فائدہ نہیں کہ ہم ایک انتہائی انقلابی دور سے گذر رہے ہیں ہم فطرتاً اور روایت کے لحاظ سے انقلاب کے خلاف ہیں ہماری روایت یہ ہے کہ ہم آہستہ خرامی سے چلتے ہیں لیکن جب چلتے ہیں تو بڑی تیز رفتاری کے ساتھ دنیا کی کوئی شے اپنی جہات میں انقلاب سے بچ کر نہیں بھاگ سکتی۔''(۱)

۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ شبلی کی دوررس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ مسلم لیگ ہندوستان کی آزادی میں معاون ہونے کے بجائے اس کی راہ کا روڑا ہے اور کسی قربانی اور ایثار کیلئے تیار نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے شدت سے اس کی مخالفت کی اور اس کے خلاف متعدد نظمیں لکھیں، جن میں ان کے محدود مقاصد اور ان کی بے عملی پر تنقید طنز و تعریض کی۔ اس بات سے شبلی کی بیدار مغزی اور روشن خیالی کا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی ایسے سمجھوتے کیلئے تیار نہیں تھے، جو ہندوستانیوں کی غلامی اور غفلت کو قائم رکھنے میں مدد دے۔

کانگریس کا انتہا پسند طبقہ انگریزوں کے نام نہاد وعدوں سے خوش نہیں تھا تلک نے جو ۱۹۱۴ء میں رہا ہوئے جیل سے باہر آتے ہی اپنی سیاسی سرگرمیاں پھر سے جاری کر دیں اور ہوم رول لیگ کی بنیاد ڈالی، جو ۱۹۱۶ء تک باضابطہ تحریک بن گئی اور اینی بیسنٹ کی کوششوں سے اس نے ہندوستان گیر حیثیت حاصل کر لی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت روز بروز بڑھ ہی رہی تھی، چنانچہ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ میں لکھنؤ میں معاہدہ ہوا اور دونوں پارٹیاں مل کر سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لئے احتجاج کرنے لگیں۔ ۱۹۱۷ء میں اینی بیسنٹ جو ہوم رول تحریک کی رہنمائی کر رہی تھیں ان کو قید کر لیا گیا۔ ان کی گرفتاری نے عوام کے سیاسی جذبات کو اور مشتعل کر دیا اور ملک کے گوشے گوشے سے ہوم رول کی آوازیں اٹھنے لگیں کانگریس اور لیگ کی مشترکہ کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۱۹۱۷ء میں وزیر مانٹیگو نے خود ہندوستان آ کر لارڈ چمسفورڈ وائسرائے ہند کی شرکت میں ایک رپورٹ شائع کی، جسے ۱۹۱۹ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے

---

(۱) تاریخ کانگریس ص ۲۱۱۔

قانون کی شکل دے دی۔قوم پرستوں کو اس قانون سے سخت مایوسی ہوئی۔ بقول ڈاکٹر عابد حسین:

''ان پر پہلی بار یہ تلخ حقیقت کھلی کہ برطانوی حکومت کے وعدوں اور ان کے ایفا کے درمیان راستہ سیدھا اور ہموار نہیں بلکہ سامراجی مصالح کے پیچ وخم اور پارٹی گورنمنٹ کے نشیب وفراز سے گذرتا ہے۔ چنانچہ لیگ اور کانگریس دونوں نے اس کی مخالفت کی۔ ملک میں اس قانون کے خلاف ردعمل کی جو عام فضا تیار ہوئی، حسرت موہانی کی یہ نظم اس کی بہترین ترجمانی کرتی ہے:

کس درجہ فریب سے ہے مملو
تجویز ریفارم مانٹیگو
مشہور زمانہ ہیں مسلم
دستور کے حسب ذیل پہلو
قانون پر اختیار کامل
عمال پر زور زر پہ قابو
ان میں سے نہ ہو جب ایک کی بھی
گلہائے ریفارم میں کہیں جو
کاغذ کے سمجھئے پھول ان کو
جن میں نہیں نام کو بھی خوشبو
مدراس کے ڈاکٹر(۱) کا یہ قول
کس درجہ ہے دل پذیر دیکو
مقصود ہے صرف یہ کہ تا جنگ
ہم سب رہیں صرف ایں تگاپو

---

(۱) ڈاکٹر سبرامنی ایر۔

اے ہندی سادہ خبردار
ہرگز نہ چلے تجھ پہ یہ جادو
کیا پائے گا خاک پھر جب ان سے
اس وقت بھی کچھ نہ لے سکا تو

پہلی جنگ عظیم کے بعد کچھ ایسے حالات رونما ہوئے کہ سیاسی جدوجہد جو اب تک تعلیم یافتہ یا متوسط طبقے تک محدود تھی، بے حد وسیع اور شدید ہوگئی اور سچے معنوں میں عوامی تحریک بن گئی۔ نچلے متوسط طبقہ مزدوروں اور کسانوں پر اس کا اثر نہایت گہرا ہوا اور ان کی معاشی بے چینی بہت جلد سیاسی بے چینی کی شکل اختیار کرگئی۔ اس زمانے میں تلک کے انتقال کے بعد قومی تحریک کی باگ ڈور مہاتما گاندھی کے ہاتھ آئی، جنہوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کو روبہ کار لاکر ملک کے تمام حریت پسندوں کو کانگریس میں جمع کردیا اور تحریک آزادی میں پہلی دفعہ سب طبقوں کے اور مختلف خیالوں کے لوگ شامل ہوئے ملک کی اس بڑھتی ہوئی سیاسی بیداری کو دیکھ کر انگریزوں نے رولٹ بل پاس کیا، جس کا منشا تحریک آزادی کا گلا گھوٹنا تھا اور ہندوستانیوں کی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کرنا تھا۔ انگریزوں کی اس سختی پر ہندوستان کے عوام بہت برہم ہوگئے جگہ جگہ مظاہرے کئے گئے اور ہڑتالیں ہونے لگیں، احتجاجی جلسے کئے گئے، امرتسر کے ایسے ہی پرامن جلسے میں ۱۲/اپریل ۱۹۱۹ء کو جنرل ڈائر نے نہتے ہندوستانیوں پر گولیوں کے سولہ سوراؤنڈ چلائے اور آن کی آن میں سیکڑوں مشین گنوں سے ہندوستانیوں کو بھون ڈالا۔ بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ: ''اس حادثے میں قریب ۱۲۰۰ آدمی زخمی اور ۴۰۰ سے زیادہ مارے گئے۔'' (۱)

اس واقعہ نے ملک بھر میں شدید نفرت کی برقی رو دوڑا دی۔ اس کے بعد پنجاب میں دو مہینے تک کرفیو نافذ رہا۔ خبروں کے سنسر ہونے کا یہ عالم تھا کہ جلیان والے باغ کے حادثے کی اطلاع لندن میں آٹھ مہینے بعد پہونچی۔ اس واقعہ کا اثر ہندوستان میں یہ ہوا کہ اب تک جو کام لیڈروں کی شعلہ بیانیوں اور مشاعروں

---

(۱) ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری ڈاکٹر گوپی چند نارنگ قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو نئی دہلی ۲۰۰۳۔

کی آتش نوائیوں نے نہیں کیا تھا وہ اس نے کر دکھایا۔ شہیدوں کا خون ناحق ہندو اور مسلمانوں کے ربط واتحاد کا رشتہ بن گیا اور تحریک آزادی کا جذبہ پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ گیا اردو شاعروں نے بھی اس کا گہرا اثر لیا اقبال کا یہ قطعہ اسی دردناک واقعہ کی یاد تازہ کرتا ہے:

ہر زائر چمن سے یہ کہتی ہے خاک باغ
غافل نہ رہ جہاں میں تو گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خون شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

جلیان والے باغ کا حادثہ ہمارے سفر آزادی کا ایک بڑا ہی دردناک حادثہ ہے شہید ہونے والے چار سو ہندوستانیوں نے قربانی کی ایسی مثال قائم کی کہ اس کے چراغ سے کئی چراغ جل اٹھے۔ محروم نے اس سے جو اثر لیا وہ بہت کم شاعروں کے حصے میں آیا، انہوں نے اس سے متاثر ہو کر کئی نظمیں لکھیں یہ سب کی سب انگریزوں سے نفرت کے زہر میں بجھی ہوئی ہیں اور ان کے ظلم واستبداد کے خلاف دردناک احتجاج کی حیثیت رکھتی ہیں، چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

نادر کا قتل عام ہے مشہور آج تک
سفاک اس کا نام ہے مشہور آج تک
لیکن ہے جور نادر سفاک سے سوا
ڈائر کے قتل عام کا پرہول ماجرا
اس نے کیا تھا قتل رعایائے غیر کو
جو ہو چکی تھی جنگ میں خود اس کے روبرو
ڈائر نے قتل عام کیا اس مقام پر
مرتے جہاں ہیں لوگ اطاعت کے نام پر

یورپ لہو سے جن کے ابھی لالہ زار ہے
اب تک ہوائے دشت میں جن کا غبار ہے
ان کے ہی بھائی بند تھے اس باغ میں جہاں
ساون کے بادلوں کی طرح برسیں گولیاں
شامل تھے ان میں پیر بھی اور خورد سال بھی
دل میں کسی کے تھا نہ خطر کا خیال بھی
میلہ سمجھ کے باغ میں داخل ہوا کوئی
جمگھٹ عجیب جان کے شامل ہوا کوئی
نکلا تھا کوئی لوٹنے فصل بہار کو
آغوش میں لئے تھا کوئی شیر خوار کو
تھی درمیان باغ ہزاروں کی بھیڑ بھاڑ
ناگاہ اک طرف سے چلی گولیوں کی باڑ
پھر وہ ہوا کہ جس سے لرزتی ہے تن میں جاں
پتھر کا دل بناؤں تو کچھ ہو سکے بیاں
ڈائر کے قتل عام نے خون وفا کیا
لوہو سے لال دامن برطانیہ کیا

(ماخوذ از نظم ''ڈائر اور نادر'')

ہندو اور مسلمانوں میں باہمی اتحاد اور اخوت کو بڑھاوا دینے کیلئے محروم نے کئی نظمیں کہیں ان میں انگریزوں کی حکمت عملیوں کی طرف اشارے ہیں، نفاق کی برائیوں اور اتفاق کی خوبیوں کا بیان ہے اور متحد ہو کر آزادی کی جنگ جیتنے کی بشارت ہے۔ آزادی کی منزل سر کرنے کیلئے محروم نے سب سے زیادہ زور

قومی اتحاد اور یگانگت پر ہی دیا ہے۔ انہوں نے پھوٹ، نفاق اور تنگ نظری تعصب اور فرقہ واریت کی سخت سے سخت الفاظ میں مذمت کی ہے، وہ چاہتے تھے کہ اپنے شعور و احساس کی پوری قوت سے ان سماج دشمن برائیوں کا سدباب کریں، تا کہ ہندوستان ایک بار پھر گوتم نانک اور چشتی کی روح پرور نظموں سے گونج اٹھے۔

جلیان والا باغ کے حادثہ کا ذکر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب میں اس طرح کیا ہے:

''جلیان والا باغ کا حادثہ ہماری قومی تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے، اس کے بعد سے حکومت کا سیاسی اختساب روز بروز بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ اسی نسبت سے تحریک آزادی بھی ہمہ گیر ہونے لگی۔ مسلمانوں کے انگریزوں سے بیزار ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جنگ کے بعد حکومت برطانیہ نے ترکی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اسلامی ملکوں کو اپنی سیاسی بساط کے مہروں کی طرح استعمال کرنے لگی۔ ہندی مسلمان ترکی خلافت کو عالم اسلام کے تہذیبی اور سیاسی اتحاد کا مرکز سمجھتے تھے اس لئے انگریزوں کی سیاسی چالیں وہ نہایت نفرت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ برطانوی حکومت کی مخالفت کے منفی جذبے میں ہندو بھی مسلمان کے ساتھ تھے، کیونکہ ایشیاء میں برطانوی اقتدار کا قائم رہنا ہندوستان کی تحریک آزادی کے حق میں نیک فال نہ تھا۔ چنانچہ دونوں نے مل کر تحریک خلافت شروع کی اور ۱۹۲۰ میں کلکتہ کے اسپیشل کانگریس اجلاس میں عدم تعاون کا پروگرام منظور کر کے انگریزوں کے خلاف پرامن بغاوت کا اعلان کر دیا گیا۔ بعد میں مسلمان علماء نے بھی فتویٰ جاری کر کے خلافت پروگرام کی تائید کی۔ اس طرح انگریز دشمنی اور آزادی کا جذبہ ملک کے کونے کونے تک پہونچ گیا۔ بقول ڈاکٹر عابد حسین:

''عدم تعاون کے پروگرام نے ہندوستانیوں کے دل سے قنوطیت اور مغلوبیت دور کر کے ان کے اندر یہ امید پیدا کر دی کہ ایک نہتی اور محکوم قوم بھی خودداری اور خود اعتمادی کی زندگی گذار سکتی ہے۔ سارے ہندوستان میں ایک سرے سے اس سرے تک پرامن بغاوت کی تحریک زور شور سے اٹھ کھڑی ہوئی۔'' (۱)

شاعر سماج کا سب سے زیادہ حساس طبقہ ہوتا ہے۔ دوسرے افراد سماج کے ساتھ وہ بھی حالات کو

---

(۱) ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری ص ۳۵۵ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو نئی دہلی ۲۰۰۲ء۔

دیکھتا اور متاثر ہوکر اپنے جذبات دل کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ اردو ادب نے بھی ان حالات کا اثر قبول کیا اس زمانے میں سیکڑوں نظمیں کہی گئیں۔ یہ سب اعلیٰ پایہ کی نہ سہی لیکن اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ شاعروں نے تحریک آزادی میں حصہ لیا، ان نظموں میں انگریزوں کے سرمایہ دارانہ نظام حکومت کی مذمت ملتی ہے اور باہم متفق ہوکر آزادی کی جدوجہد کو جاری رکھنے کی پرزور دعوت دی گئی ہے۔ حسرت موہانی، ظفر علی خاں، نیاز فتح پوری اور سید ہاشمی فریدآبادی نے اس سلسلے میں متعدد ولولہ خیز نظمیں لکھیں۔ خوشی محمد ناظر، غلام بھیک نیرنگ اور آغا حشر جیسے لئے دئے رہنے والے شاعروں نے بھی قومی بیداری میں حصہ لیا۔ الہلال اور ہمدرد ترک موالات کا صور پھونک رہے تھے۔ محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی نے اس زمانے میں بڑے پرجوش مضامین لکھے۔ یہ زمانہ ہندو مسلم اتحاد کے عروج کا زمانہ تھا۔ زاہدہ خاتون شروانیہ مرحومہ قومی آہنگی سے متاثر ہوکر لکھتی ہیں:

جنت کی دید سے ہے دل شادماں ہمارا
شکر خدا وطن ہے ہندوستاں ہمارا
کہتے ہیں ہم کو ہندی حب وطن ہے ایماں
کیا پوچھتے ہو دین ونام ونشاں ہمارا
آلام مسلمیں پر بولے تڑپ کے ہندو
سودوزیاں ہے ان کا سودوزیاں ہمارا
ہوجائے کاش ثابت روحوں کی کوچہ گردی
بن جائے کاش گاندھی ہر نوجواں ہمارا
جاں سے بدن سے خوں سے ہندوستاں کے ہیں ہم
حیرت کہ کیوں نہیں ہے ہندوستاں ہمارا

حسرت موہانی کے یہ چند اشعار بھی اس زمانے کے سیاسی ہیجان کا نتیجہ ہیں:

غضب ہے کہ پابند اغیار ہوکر
مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہوکر
سمجھتے ہیں سب اہل مغرب کی چالیں
مگر پھر بھی بیٹھے ہیں بے کار ہوکر
اٹھے ہیں جفا پیشگان مہذب
ہمارے مٹانے پر تیار ہوکر
کہیں صلح ونرمی سے رہ جائے دیکھو
نہ یہ عقدۂ جنگ دشوار ہوکر

اس غزل کے آخری شعر سے صاف ظاہر ہے کہ گاندھی جی کے رویے کے برخلاف حسرت سیاست میں اعتدال پسندی کے قائل نہیں تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب ہندوستان کا ذرہ ذرہ بے چینی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ ان سب میں ایک چیز مشترک تھی کہ سب کے سب اپنے ملک کی غلامی پر شرمندہ تھے اور کسی خوبصورت منزل کی تلاش میں تھے۔ ۱۹۳۶ء کے بعد سیاسی آزادی کے معنیٰ معاشی آزادی ہوگئے تھے۔ سوشلسٹ پارٹی، کسان سبھائیں اور ٹریڈ یونینیں وجود میں آچکی تھیں اور قومی جدوجہد میں حصہ لینے لگی تھیں۔ مجموعی طور پر ہندوستان سامراج سے آخری ٹکر لینے کو تیار ہورہا تھا۔ لیکن برطانوی حکومت ہندوستانیوں کا جوش وخروش ٹھنڈا کرنے کیلئے انہیں جھوٹی آزادی کا خواب دکھا کر طفل تسلی میں رکھنا چاہتی تھی، جس سے ہندوستانی بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ بقول ظفر علی خاں:

کاغذی گھوڑا دیا ہم کو سواری کیلئے
اک کھلونا بھیج کر بچوں کا دل بہلا دیا

یہ نیا وفاق یکم اپریل ۱۹۳۷ء کولا گو ہوا تھا جوش اس کی حقیقت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

اس نوحۂ خزاں کو سمجھنا نوید گل
اک بے پناہ چوک ہے اک سخت بھول ہے

یہ بوستاں یہ اہل سیاست کی شاخ گل

شیطاں کے پاس باغ کی سوکھی ببول ہے

ناداں سمجھ رہے ہیں کہ حاصل ہوا وفاق

دانا سمجھ رہے ہیں کہ اپریل فول ہے

اس وفاق سے انگریزوں کی غرض یہ تھی کہ برطانوی صوبوں اور ہندوستانی ریاستوں کو ملا کر مرکز میں ایک وفاقی حکومت قائم کی جائے، اس کی پورے ملک میں ہر طرف سے مخالفت کی گئی اور یہ ایکٹ نافذ نہ ہوسکا۔

۱۹۳۱ء میں دوسری جنگ چھڑ گئی اور انگریزوں کو اس جنگ میں شکست کے سارے آثار نظر آنے لگے۔ لیکن ہندوستانی رائے عامہ جنگ کو لمحہ غنیمت سمجھتی تھی اور زیادہ تر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ آزادی کا مطالبہ پورے زور وشور سے کیا جائے۔ چنانچہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے حکومت کے سامنے یہ شرط رکھی کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزاد کرنے کا وعدہ کیا جائے تب ہی اس نازک وقت میں اس کی مدد ممکن ہے لیکن حکومت برطانیہ نے سنی ان سنی کردی، ادھر نازی جنگ میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کر رہے تھے اور حکومت کے پرخچے اڑتے دکھائی دے رہے تھے، بقول سردار جعفری:

ہل چکا ہے تخت شاہی گر چکا ہے سر سے تاج

ہر قدم پر ڈگمگایا جارہا ہے سامراج

جاپان کے بڑھتے ہوئے قدم اور اپنی کمزوری کا احساس کرتے ہوئے برطانیہ کی جنگی کیبنٹ نے کرپس کی سرکردگی میں ایک وفد ہندوستان بھیجا کہ ان کو پھر کاغذی گھوڑا جیسا کھلونا دیکر اپنا مطلب حاصل کرلیا جائے، ان کا منشا تھا'' کہ ہر صوبے کو اور ریاست کو آزادی ہوگی کہ وہ ہندوستانی وفاق میں شامل ہوجائے یا براہ راست تاج برطانیہ سے تعلق رکھے۔ ان کی یہ پیش کش کسی سیاسی جماعت کو مطمئن نہ کرسکی اور کرپس مشن ناکام ہوکر لوٹ گیا۔ جوش ملیح آبادی کے یہ اشعار اس وقت کی ہندوستانی رائے عامہ کی یوں عکاسی کرتے ہیں:

کھلاڑی اب کے لائے ہیں نئے مہرے نئے پانسے
کہ تا اس بار کھیلیں ہندوالوں کی رگ جاں سے
بڑی کاریگری کے ساتھ شاطر نے تراشے ہیں
نئے دھوکے نئے حیلے نئے چکمے نئے جھانسے

انگریزوں کی بے حسی دیکھتے ہوئے اگست ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑ دو ( Quit India Movement) تحریک کا آغاز ہوا اس زمانے میں سبھاش چندر بوس روپوش ہو کر کسی طرح جاپان پہونچ گئے تھے۔ اس سے انگریزوں کو شک ہوا کہ پوری کانگریس جاپان سے ساز باز رکھتی ہے اور اس کی مدد سے ہندوستانی حکومت (انگریز حکومت) کا تختہ پلٹ دینا چاہتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے یکدم گاندھی اور ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ انگریزوں کی اس حرکت قبیح سے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لوگوں میں شدید غم و غصہ بھڑک اٹھا اور چاروں طرف سے فساد کی ایک لہر دوڑ گئی اور آزادی کی آرزو ہر دل میں تیز تر ہو گئی، بقول شمیم کرہانی اس وقت:

تھا زبانوں پر یہ نعرہ آشیاں کو چھوڑ دو
چھوڑ دو اے غاصبو ہندوستاں کو چھوڑ دو

اردو ادب نے بھی اس زمانے میں جذبۂ آزادی تیز سے تیز تر کرنے میں وقت کا ساتھ دیا۔ آزادی کے گیت گائے گئے اور آزادی کی بشارت دے دے کر راہ کی دشواریوں کو گوارا کرنے کی تلقین کی گئی، جوش ملیح آبادی نے وقت کا یہ پیغام سنایا:

اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

فراق گورکھپوری نے آزادی اور زمانے کا چیلنج جیسی نظمیں لکھیں اور آنے والے تاریخی بدلاؤ کا پتہ دیتے ہوئے کہا:

عالم نزع ہے آئین شہنشاہی کا
چارہ گر اب تری بیکار مسیحائی ہے

سن ۱۹۴۲ کی اس ہندوستان چھوڑ دو تحریک کا جواب انگریزی حکومت نے نہایت بے رحمی اور سختی سے دیا۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی بدانتظامی اور مقامی حکام کی بددیانتی کی وجہ سے ہندوستان میں قحط اور وبائی امراض کا دور دورہ ہوا۔ اس وقت دنیا کا ایک بڑا حصہ جنگ کی لپیٹ میں آچکا تھا اور اس کے مہیب بادل ہندوستان کی طرف بھی نہایت تیزی سے بڑھ رہے تھے۔

ادھر اندرون ملک قحط بھوک اور وباؤں کا اندر جال پھیلا ہوا تھا یہ سیاسی اور معاشی بے چینی اور کرب اردو شاعری میں بھی بخوبی دیکھا جاسکتا ہے اس حوصلہ شکن ماحول نے انگریزوں کی عطا کردہ کاغذی پھولوں سے سجی ہوئی ساری آرائشیں نوچ پھینکیں اور ان کی بے رنگی ظاہر کردی۔ اردو میں اس واقعے کے بارے میں جہاں ان داتا جیسے افسانے لکھے گئے، وہاں قحط بنگال (جگر مراد آبادی) تازیانہ (روش صدیقی) بھوکا بنگال (وامق جونپوری) اور کیوں گنگا کے دھارے (شمیم کرہانی) جیسی نظمیں تخلیق کی گئیں۔ ان نظموں کا آہنگ ان کا درد واثر اور اجتماعی جوش بے پایاں وطن دوستی کا حامل ہے۔ اس زمانے میں جب ملک آزادی کی منزل سے قریب ہو رہا تھا ان وطن دشمنوں نے تہذیبی مسائل کو بری طرح الجھا دیا تھا۔

بقول پروفیسر احتشام حسین:

''ادیبوں کا ایک گروہ زندگی کی ان نئے قدروں کو جمہوری اور نسانی نقطہ نظر سے دیکھتا تھا لیکن کسی نہ کسی گوشے سے زہر کی وہ دھار بھی پھوٹ بہتی تھی، جو آزادی اور جمہوریت کے بہتے ہوئے دریا میں ایک لکیر کی طرح قائم ہوگئی تھی ............ ٹھیک اسی وقت ہندوستانی مسلمانوں کے ایک اچھے خاصے بڑے طبقے نے فرقہ وارانہ بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم کا متفقہ مطالبہ کیا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان کی سیاست میں یہ بہت ہی نازک موقع تھا لیکن اردو کے کسی اچھے بڑے شاعر یا ادیب نے اس مطالبہ کی تائید نہیں کی۔ اردو ادیبوں کیلئے باعث فخر ہے کہ وہ فرقہ واریت کے اس سیلاب میں نہیں بہے۔ اگر کسی نے اس مطالبہ تقسیم کو صحیح

سمجھا تو اس کی سیاسی نوعیت بالکل جداگانہ تھی۔ فرقہ وارانہ تقسیم سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔''(۱)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''ترقی پسند شاعری کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہماری وطنیت کے دھارے وسیع بنیادوں پر استوار کئے اسے غیر مذہبی بنیادیں دیں اور مذہب وملت کی بندشوں اور سماجی اونچ نیچ کی پابندی سے یکسر آزاد کیا۔ اس نے اپنا رشتہ محنت کش عوام اور پسماندہ طبقے سے جوڑا، اس کی کاوشوں سے اردو شاعری کی بساط دور تک پھیلی اور وطن سے محبت اور ماحول کی سخت گیری کے خلاف نفرت کا جذبہ گھر گھر پھونچا۔ ترقی پسند شاعروں نے حسن وعشق کے روایتی تصور کو بدل کر نئی زندگی کے حقائق کی نقاب کشائی کی شاہ راہ کھول دی اب شاعری ایک لحہ سرخوشی کی یاد نہ رہی بلکہ دردمند دل کی فریاد بن گئی۔ آزادی اور جمہوریت پر زور دیا جانے لگا اور فن میں تجربات کا دور شروع ہوا۔''(۲)

یہ ایک طرح کا ایک انقلابی رنگ تھا، جو دوسری جنگ عظیم کے زمانے تک اردو شاعری کی فطرت ثانیہ بن گیا۔ اس کی ابتداء جوش کی شاعری سے ہوتی ہے ویسے تو اقبال، چکبست اور ظفر علی خاں کی شاعری میں بھی انقلابی رنگ پایا جاتا ہے لیکن اس سے بعد میں مفہوم لیا گیا اس کی روایت جوش سے ہی شروع ہوتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ ۱۹۴۵ء تک ہندوستان کی تحریک آزادی اپنے آخری دور میں داخل ہو چکی تھی عوام کی بڑھتی ہوئی بے چینی کرپس مشن کی ناکامی جنگ کے آلام بین الاقوامی صورت حال اور آزاد ہند فوج کا غلغلہ ہندوستان کو نہایت تیزی سے اس منزل کی طرف لا رہا تھا، جسے جوش نے یوں ادا کیا ہے:

لیلائے آب ورنگ کا ڈیرا قریب ہے
تارے لرز رہے ہیں سویرا قریب ہے

ہمارا مشہور قومی نعرہ ''جے ہند'' اس زمانے میں مقبول ہونا شروع ہوا۔ تلوک چند محروم اپنی نظم سحر نو میں اس زمانے کا نقشہ یوں دکھاتے ہیں:

---

(۱-۲) بحوالہ ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری ص ۳۰۷ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اردو نئی دہلی ۲۰۰۲۔

جے ہند کے نعروں سے فضا گونج رہی ہے

جے ہند کی عالم میں صدا گونج رہی ہے

یہ ولولہ یہ جوش یہ طوفان مبارک

ہر آن مبارک

۱۹۴۰ء میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوگئی۔ ہندوستان کی سیاسی گتھی سلجھانے کیلئے کیبنیٹ مشن بھیجا گیا۔ لیکن اس کی پیش کش نے کسی سیاسی پارٹی کو مطمئن نہیں کیا اور اسے ناکام لوٹنا پڑا۔ جوش نے اس ''تثلیثی'' فریب سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا:

چھری دبائے ہوئے بغل میں اہل مشن

شفیق بن کے مگر مسکرائے جاتے ہیں

پڑی ہوئی ہے جہاں خاروحسن پہ چادر گل

وہ سبز باغ ہمیں پھر دکھائے جاتے ہیں

احمد ندیم قاسمی نے ''سمندر پار کے فرشتہ ہائے رحمت'' کو وقت کا چیلنج سناتے ہوئے کہا:

مورخوں سے کہو خون میں ڈبوئیں قلم

بدل چکا ہے زمانے میں اضطراب اپنا

فزاں رہے کہ بہار آئے ہرچہ بادا باد

اب اک زقند کا ہے منتظر شباب اپنا

ادھر برطانیہ میں لیبر حکومت کے برسراقتدار آتے ہی ہندوستان کی آزادی کی امید قوی ہوگئی۔ اس لئے کہ یہ لیبر پارٹی ہندوستان کو آزادی دینے کے حق میں تھی۔ لیکن خود ہندوستان میں تہذیبی مسئلہ جسے اب تک کانگریس موردالتوئی میں ڈالے ہوئے تھی ایک خطرناک تفریقی قوت کا روپ اختیار کر چکا تھا۔ مسلم لیگ اس کی آڑ میں مسلمانوں کو کانگریس سے الگ کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی اور تقسیم ملک کا مطالبہ جو

سراسر احمقانہ تھا روز بروز شدت اختیار کر رہا تھا۔ اس وقت ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ماونٹ بٹین تھے ان کی سرکردگی میں کانگریس اور مسلم لیگ میں بہت دنوں تک آپسی سمجھوتے کی بات چیت ہوتی رہی۔ آخر یہی طے پایا کہ ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ برطانیہ کی پارلیامنٹ نے یہ تجویز مان لی اور آخر کار ۱۵؍ اگست ۱۹۴۷ء کو برصغیر تقسیم ہوا۔ اس طرح دو ملک ہندوستان اور پاکستان وجود میں آ گئے۔ ملک کے تقسیم ہونے یا نام نہاد آزادی ملنے کے آٹھ دس مہینے پہلے کا اردو ادب جو منظر نامہ پیش کرتا ہے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے احتشام حسین لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں اردو ادیبوں کی کاوشوں میں تین خواہشات کی جھلک واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہیں: (۱) ہندوستان کا جسم زخمی نہ کیا جائے۔ (۲) فرقہ واریت انگریزی سیاست کی ناجائز اولاد ہے اس کا گلا گھونٹ دیا جائے اور (۳) اگر ہندوستان تقسیم ہوتا ہی ہے تو مہاتما گاندھی کے الفاظ میں اس طرح ہو کہ جیسے بھائی بھائی اپنی ملکیت تقسیم کرتے ہیں۔ یعنی یہ تقسیم انگریزوں کے ہاتھوں سے نہ ہو بلکہ آپس کے سمجھوتے کا نتیجہ ہو۔''

اس سیاسی بحران میں جو ہندوستان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا ادیبوں کا اس طرح سوچنا بے حد قابل قدر تھا۔ افسانوں ڈراموں اور ناولوں میں تو نہیں لیکن شعری ادبیات میں ایسے مقامات بہت سے ملیں گے، جہاں شاعر نے قومی رہنماؤں کو برطانوی سیاست کی چال بازیوں سے آگاہ کیا ہے اس کے جال میں پھنسنے سے روکا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اپنے رہنماؤں کی غلط کاریوں پر تنقید بھی کی ہے۔ مختلف سیاسی مکاتیب فکر سے تعلق رکھنے کے باوجود ملک کی سیاسی اور معاشی آزادی کی خواہش میں جوش، مجاز، مخدوم، جاں نثار اختر، فیض، فراق، علی سردار جعفری، کیفی، قاسمی، شمیم کرہانی، آنند نرائن ملا وغیرہ ہم آواز رہے۔'' (۱)

بہرحال انگریز ہندوستان چھوڑ گیا، لیکن اقبال سہیل کے لفظوں میں:

لالے کو دبایا سنبل سے قمری کو لڑایا بلبل سے
جاتا تو ہے صیاد مگر گلشن کو لٹا کر جاتا ہے

(اقبال سہیل)

(۱) بحوالہ احتشام حسین مشمولہ کتاب ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری از گوپی چند نارنگ قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو نئی دہلی ۲۰۰۲ء۔

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد تو ہوگیا لیکن اس کا سارا جسم زخمی لہولہان، زمین سے آسمان تک فرقہ واریت کا زہر گھلا ہوا، اس زمانے میں تعصب اور تنگ نظری کی آگ اتنی بھڑک چکی تھی کہ صدیوں کا تہذیبی سرمایہ اس میں راکھ ہوتا نظر آ رہا تھا۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے اور درندگی، سفاکی اور بربریت کی وحشی قوتیں سر اٹھائے دندناتی پھرتی تھیں، ہندوستان کی ترقی اور سربلندی کا خواب دیکھنے والوں کو ان حالات سے سخت صدمہ پہونچا اس وقت ملک میں جو بجھی بجھی فضا اور درد و کرب کی لہر تھی وہ فیض کی نظم ''صبح آزادی'' کے اشعار میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگئی، اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
فلک کے دشت کے تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جاکے رکے گا سفینۂ غم دل
جگر کی آگ نظر کی امنگ دل کی جلن
کسی پہ چارہ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگار صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانی شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدۂ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

سچائی یہ ہے کہ اس دور خوں چکاں صبح آزادی کی درد و ٹیس سے لبریز یہ آرزومندی جتنی سچی اور برحق

اس زمانے میں تھی اتنی آج بھی سچ ہے۔

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں فرقہ وارانہ فسادات نے جو سیاسی اور سماجی انتشار تہذیبی اور اخلاقی انحطاط پیدا کر دیا تھا اور جس طرح اخوت، انسانیت اور اعلیٰ اقدار کی طرف بے یقینی پیدا ہو رہی تھی وہ ہمارے ملک کا دردانگیز المیہ ہے۔ ان فسادات اور سیاسی بدنظمیوں نے بہت سے ذہنوں کو پراگندہ کر دیا تھا صرف عوام الناس ہی نہیں بہت سے افسانہ نگار ادیب و شاعر بھی اسی سیلاب میں بہہ گئے اور اپنی تحریروں سے یا تو فرقہ واریت کی حمایت کرنے لگے یا اسی درندگی اور بہیمیت سے لطف اندوزی کا سامان فراہم کر لیا۔ پاکستان میں سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری نے اپنی تحریروں سے منفی رجحانات کو ہوا دی اور حقیقت نگاری اور نفسیاتی تحلیل کے نام پر انسانی فضیلت اور بنیادی سچائی سے ہی انکار کرنے لگے۔ حالانکہ اسی زمانے میں سیاسی ہیجان کی وجہ سے کسی ایسے فن پارے کی تخلیق کرنی جو ایک طرف صحت مند زاویہ نظر کی ترجمانی کرتا ہو اور دوسری طرف تجزیہ اور تحلیل کی منزلوں سے گذر کر تکمیل فن کا بھی مظہر ہو، بہت مشکل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس موضوع پر کرشن چندر کے اکثر و بیشتر افسانے جو ''ہم وحشی'' کے نام سے ایک مجموعے کی صورت میں شائع ہوئے جذباتیت اور ہیجان کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسی طرح بیدی کا افسانہ ''لاجونتی''، عصمت چغتائی کی ''جڑیں''، حیات اللہ انصاری کا ''شکر گزار آنکھیں'' اور ناولٹ ''ماں بیٹا'' خاص طور پر اہم ہیں۔ اس زمانے کے فسادات کو موضوع بنا کر اور بھی بہت کچھ لکھا گیا، جن میں فکر تونسوی کا رپوتاژ ''چھٹا دریا''، رامانند ساگر کا ناول ''اور انسان مر گیا'' خواجہ احمد عباسی کا ''سردار جی'' بھی شامل ہیں۔

(ب) لکھنؤ کی شاعری کے مخصوص رجحانات:۔ لکھنؤ کی شاعری یا لکھنوی سے مراد شعر و ادب میں وہ خاص رنگ ہے، جو لکھنؤ کے شعرائے متقدمین نے اختیار کیا اور جو بعض اپنی مخصوص خصوصیات کی بنا پر قدیم شاعری سے الگ ہے، یہ کہنا درست ہے کہ متاخرین شعرائے لکھنؤ نے قدیم رنگ میں اصلاح کر کے ایک نیا انداز سخن پیدا کر لیا تھا۔ حقیقت میں لکھنؤ شاعری کا اصل رجحان اس زمانے میں اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ جب لکھنؤ میں نشاط کا دور تھا، دولت کی فراوانی اور ہر طرف خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ لکھنؤ میں ایسی کشش تھی

کہ ہر طرف سے اہل فن اور صاحب کمال کھنچے چلے آتے تھے، اس طرح لکھنؤ کی سرزمین بجا طور پر فخر البلاد بن گئی تھی۔ ان ہی باکمالوں میں ایسے باکمال شعراء بھی تھے، جن کے وجود پر ہندوستان کو ناز تھا، جواب تک گردش روزگار کا شکار ہو کر بھٹکتے پھر رہے تھے، ان میں سے جو یہاں آ گیا پھر مر کر ہی اٹھا۔

دولت کی فراوانی نے لکھنؤ کی فضا کو تعیش اور آزادی کی راہ دکھائی اور تماش بینی پر لوگ فخر کرنے لگے۔ چنانچہ یہاں کا ادب بھی اس میلان کو ظاہر کرتا ہے۔ جذبات کی پاکیزگی اور بیان کی سنجیدگی جو دہلوی شاعری کا خاص وصف ہے یہاں نظر نہیں آتا اور اس کی جگہ معاملہ بندی نے لے لی اس معاملہ بندی کے ساتھ ساتھ شاعری میں ابتذال اور رکاکت کے عناصر غالب آ گئے۔ اسی سلسلے میں نسائیت کا عنصر بھی شعر وادب کا جزو بن گیا ریختہ کے جواب میں ریختی کو ترقی دیکر بے حیائی اور بے شرمی کی شاعری ہونے لگی۔ مثال کے طور پر جان صاحب کا یہ شعر جس میں عورت کے جذبات عورت کی زبان میں ادا کئے گئے ہیں:

اے جان ایسا چھاتی سے لپٹایا بھینچ کر
انگیا کا میری سارا مسالا مسل گیا

بہر حال اس رنگ کو اس دور میں چاہے جتنا سراہا گیا ہو لکھنؤ کی سوسائٹی پر ایک بدنما داغ ضرور ہے۔

اسی لکھنوی فضا کا ایک اہم رخ آزادی تھا، نواب وزیر کے دلی سے آزاد ہوتے ہی اہل لکھنؤ نے ہر چیز میں اپنے کو آزاد کر لیا۔ وضع قطع بدلی، لباس بدلے، آداب مجلس اور گفتگو میں فرق آیا، آزادی کے علاوہ لکھنوی فضا کا ایک اہم عنصر تکلف تھا، تمدن کی بنیاد تصنع اور تکلف اور بناوٹ پر استوار کی گئی۔ شعر وادب میں بھی تکلف اس دور کے ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کی ایک مثال رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب ہے، سرور کی عبارت نہایت پر تکلف اور بے شمار صنائع لفظی ومعنوی سے گرانبار ہے مثال کے طور پر فسانہ عجائب میں جادوگر اور جادوگرنی ہیں، جو جان عالم کو قید کرتی ہے مگر ایک نقش سلیمانی ان گے سارے جادو کو کافور کر دیتا ہے اور جان عالم پر کیا گیا سحر ختم ہو جاتا ہے۔

''پہلے تو آپ (شہ پال) حقہ آتشی پیر مرد پر مارا، پھر لشکر کے سرداروں کو للکارا، اور دو پہر تک عجیب

وغریب سحر سازی ہنگامہ پردازی جادوگراور جادوگرنیوں کی لڑائی رہی کہ دیکھی نہ سنی، کسی نے کسی کو جلایا، کسی نے بجھایا، کسی سنگ دل نے پتھر برسائے سب کچھ سحر کے نیرنگ دکھائے آخرکار جب جادوگری ختم ہوئی لڑائی کی نوبت بگرز وشمشیر ونیزہ وتیر آئی۔''

اس کے بعد چند سطروں میں گرز وشمشیر و نیزہ وتیر کی جنگ کا بیان ہے، جس میں ضلع جگت کا زور زیادہ ہےاور آلات حرب کا کم،''آخرکارفوج کوشکست ہوئی شہ پال مارا گیا۔''

جذبات نگاری ہو یا کہ واقعہ نگاری سرور نے اپنی وضع کا ہمیشہ لحاظ رکھا مثلاً اگر یہ کہنا ہے کہ شہزادے کو دیکھ کر مہر نگار دل دے بیٹھی اس کا ذکر سرور یوں کرتے ہیں:

''یہ تصور دل میں تھا کہ کارپردازان محکمہ ناکامی حاضر ہوئے اور مشاطۂ حسن وعشق نے پیش قدمی کر متاع صبر وخرد، نقد دل وجان اسامۂ ہوش وحواس تاب وتوان جگرافگار ارمغان رونمائی میں نذر شاہزادۂ والی تبار کیا۔''

''سب عقل ودانش گم صمٌ بکمٌ کا نقشہ ہوا حضرت عشق کی مدد ہوئی، سب بلا رد ہوئی''

یہی حال شعر کا ہے، شعرائے لکھنؤ نے شعر کے ظاہر پیکر پر زیادہ توجہ کی ہےاور اس اعتبار سے ان کے اشعار نہایت آبدار اور مرصع ہیں اس حیثیت سے اس دور کی شاعری ایک جمالیاتی نظریے کے تحت میں ہے یہ جمالیاتی نظریہ صنعت گری کا ہے۔ متقدمین شعرائے دہلی کے یہاں بیدل کی شاعری کا انداز مقبول تھا شعر گوئی کی شروعات ہوئی تو ایہام گوئی اور تجنس سے شروع ہوئی۔ دلی والوں نے پہلے پہل خود اس انداز کی مخالفت کی خصوصاً مرزا مظہر جاناں نے جو اس اصلاح کے امام کہے جا سکتے ہیں۔ لکھنؤ میں جب شاعری کا غلغلہ بلند ہوا۔ یہاں کی تہذیب وتمدن پر تکلیف وتصنع کا رنگ چڑھ ہی رہا تھا ادھر زبان میں وسعت پیدا ہو چکی تھی اس لئے شاعری کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی اس سے بہتر کوئی صورت ممکن نہیں تھی کہ اسے صنعت گری بنا دیا جائے۔ شاعری اور صنعت گری، جذبات نگاری اور الفاظ کی شعبدہ کاری کو باہم ملا کر لکھنوی شعراء نے ایک نیا رنگ پیدا کر دیا اور ہر رنگ کی نمایاں خصوصیات صنعت ہی کو ٹھہرایا گیا۔ رعایت لفظی یا ضلع جگت اس کے باعث ظہور میں آئی تشبیہ واستعارے میں سادہ اور نیچرل تشبیہات کے بجائے

تشبیہ در تشبیہ یا پھر تشبیہوں کے تحلیل ترکیب پر توجہ کی گئی۔ صنعت گری میں جس چیز نے سب سے زیادہ پگڑی اچھالی وہ معاملہ بندی ہے حالانکہ اس کا وجود فارسی میں پہلے ہی سے تھا لیکن اردو میں جرأت سے پہلے کسی نے اسے مستقل فن کی حیثیت سے نہیں اختیار کیا تھا۔ جرأت کے اس رنگ میں لکھنؤ کی مہذب سماج کے نقش ونگار ہیں، جس کا نمونہ سوائے شعرائے لکھنؤ اور حکیم مومن خاں مومن کے علاوہ کہیں نہیں ملتا ہے۔ ناسخ کا کلام بیشتر آتش کا کلام کمتر اور عام شعرائے لکھنؤ کا تمام تر معاملہ بندی سے بھرا پڑا ہے۔ حالی نے ٹھیک ہی کہا ہے:

مے کہ بدنام کند اہل خرد را غلط است
بلکہ مے شود از صحبت ناداں بدنام

لکھنؤ کی معاشرت اور وہاں کی زندگی کا عام رنگ یہی تھا، جسے شعرائے لکھنؤ نے اختیار کیا، جس کی داد بھی علانیہ محفلوں میں ان شاعروں کو ملا کرتی تھی۔ یہ چیزیں تو اشعار کی صنعت گری سے متعلق ہیں اس کے علاوہ لکھنؤ کا خاص رنگ خارجیت ہے۔ متقدمین شعراء نے اپنے کلام کی بنیاد واقعات اور جذبات پر استوار کی تھی اور بیان کی خوبی کے ساتھ ساتھ مضمون کی خوبی کو بھی شاعری کا لازمی جز وقرار دیا تھا۔ اہل لکھنؤ نے اس کے علاوہ شعر میں ایک دوسرا رنگ بھی بھرا وہ تھا حسن اور اس کی کیفیات سے الگ یعنی خارجی متعلقات حسن، اشعار ناسخ سے کچھ مثالیں ملاحظہ کیجئے:

بوسے لیتی ہے ترے بالے کی مچھلی اے صنم
ہے ہمارے دل میں عالم ماہی بے آب کا
نقرئی پٹھے کا تو نے نہیں ڈالا موباف
ہے سیہ سارا بدن اور دم مار سفید
بندے کانوں میں نہیں تعویذ بازو میں نہیں
وہ ستارا صبح کا ہے یہ ستارا شام کا
آتش رنگ حنا سے شمع ہیں سب انگلیاں
دست جاناں میں مرا مکتوب پروانہ ہوا

بالے موتی ہے ہیں تارے روئے تاباں آفتاب

تیرے آنے سے ابھی بام آسمان ہوجائے گا

اس نوع کی شاعری کے ساتھ اگر ہزل اور ریختی کو بھی شامل کرلیں تو لکھنوی شاعری کا سارا چہرہ سامنے آجائے گا۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں صاحب فن کا فقدان ہے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ''ان نخلستانوں کی سی ہے، جو ایک ناپیدا کنار ریگستان میں نظر آجاتے ہیں۔'' انیس اور محسن کاکوروی اس قبیل کے سرخیل ہیں۔ انہوں نے بالارادہ اپنے کلام کو لکھنویت کی اس بے پناہ سیل رواں سے روکے رکھا۔ یہاں یہ اعتراف بھی ناگزیر ہے کہ لکھنؤ نے زبان کی حک واصلاح کا زبردست کارنامہ انجام دیا اور بعض اصناف مثلاً مرثیہ، مثنوی اور ڈرامہ نگاری میں گوئے سبقت لے گئے۔

بیسویں صدی میں لکھنوی غزل کا جائزہ لیتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ اس دور میں لکھنؤ کا رنگ شاعری کیا تھا سمجھ لیا جائے لکھنوی دبستان ادب کے ساتھ بعض خصوصی امتیازات میں سب سے پہلا امتیاز شاعری میں خارجی پہلو ہے۔ قدیم شعرائے دہلی اور دکن کے عام طور شاعری کی بنیاد جذبات پر ہے اسی لئے ان کے اشعار میں حقیقی جذبات کا پہلو نمایاں ہے۔ اسی وصف نے میر اور درد کے کلام کو ابدیت عطا کردی ہے صدیاں گذر گئیں اور گذرتی رہیں گی لیکن انسان کے جذبات عشق ومحبت، سوز وگداز، درد وکسک اسی طرح آج بھی ہیں، جیسے وہ ازل سے لیکر آیا تھا۔ اس لئے ایسے اشعار جن میں یہ مضامین نظم کئے گئے ہیں وہ بھی ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ شاعری میں جذبات نگاری کے ساتھ صنعت گری بھی ضروری ہے۔ لیکن محض صنعت گری بنا دینا مناسب نہیں کیونکہ تغیر زمانہ کے ساتھ پسند وناپسند بھی تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ لکھنؤ کی قدیم شاعری عام طور پر صنعت گری کے سہارے قائم رہی اسی لئے وہاں کے شاعروں کی دماغی کاوشوں کو اس نظر سے دیکھنا لوگ پسند نہیں کرتے جس نظر سے اہل لکھنؤ اسے پسند کرتے ہیں۔

لکھنؤ شاعری کا دوسرا اہم عنصر جس کا ذکر پچھلے اوراق میں ہو چکا ہے، نسائیت ہے۔ اس کی بدولت

بعض ایسے مستقل اصناف وجود میں آئیں، جو شاعری کے چہرے کو زیب نہیں دیتی۔ اس قسم کے اذکار نعت، حمد، منقبت، مرثیہ وغیرہ میں بار نہیں پا سکتے پھر بھی یہ حیرت انگیز ہے ان فضاؤں کی مروجہ شاعری نعت کسی طرح جگہ پا سکی وہ حضرت محسن کاکوروی جیسے ثقہ کی نعت۔

لکھنوَ شاعری کا تیسرا اہم عنصر ابتذال ہے، جو مذکورہ دونوں سے عناصر کا مرکب کہا جا سکتا ہے۔ بسا اوقات یہ اس قدر کھل کر ظاہر ہوا ہے کہ یہ عموماً لکھنوی رنگ شاعری کا مترادف بن گیا ہے اس قسم کی کمزوریاں اگر بعض شعراء کے کلام میں بہتات سے ہیں تو بعض کے یہاں کمتر۔ لیکن یہ شاید ممکن نہ ہو کہ کسی کلام اس سے پاک ہو۔ لکھنوی شاعری کا ایک اور خصوص رجحان صنعت گری ہے، جس کے شوق میں شعرائے لکھنوَ نے رعایت لفظی اور ضلع جگت میں کمال پیدا کیا اسی شوق میں بعض لکھنوی شعرا بدنم بھی ہو گئے، جیسے امانت لکھنوی ان کی قادر الکلامی میں شبہ نہیں کیا جا سکتا انشاء اللہ خاں جن کے کمالات مسلم ہیں اسی گرداب میں پڑ گئے اور چہرہ تابناک کو گرد آلود کر لیا۔ اس میں کلام نہیں کہ تشبیہات، استعارے، کنائے، معنیٰ اور مضمون آفرینی ایک طرح کی صنعت گری کے لوازم ہیں اس اعتبار سے آمد سے ہٹ کر اکثر کلام میں ورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ کوشش یہ ہونا چاہئے کہ صنعت گری کی نمائش کے شوق میں پرواز تخیل مجروح ہو جائے۔ صنعت برائے صنعت نہ ہو ان تمام باتوں کے باوصف لکھنوَ نے اصلاح زبان کی جو کوشش کی ہے اس کا اعتراف نہ کرنا راقم کے خیال میں حد درجہ بد دیانتی ہے۔ اسی صفائی بیان کی بدولت بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی:

''لکھنوی شاعری ظاہری آرائش و زیبائش کے اعتبار سے عام طور پر متقدمین کی شاعری سے بہتر ہے۔ زبان کی صفائی، بندش کی چستی، محاورہ اور طرز ادا کا زور لکھنوَ کے شعراء کے یہاں عام طور پر موجود ہے۔''(۱)

**ترقی پسند تحریک کی ابتد** ا:- ہندوستان میں قومی بیداری کی جو لہر اٹھی تھی اس

(۱) لکھنوَ کا دبستان شاعری ص ۲۵۳ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نسیم بکڈپو لکھنوَ ۱۹۹۱۔

میں حالانکہ بنیادی طور پر یہاں کے سیاسی اور اقتصادی حالات اور برطانوی سرمایہ داری کی سخت گیری کو دخل تھا لیکن قومیت کے نئے تصور کے ساتھ بین الاقوامی مسائل کا شعور بھی پیدا ہو رہا تھا۔ ان مسائل کا واضح شعور اس زمانے میں ابھرا جب ۱۹۳۳ء سے جرمنی میں ہٹلر کی سرکردگی میں فاشزم نے سر اٹھایا اور پورے یورپ کو ایک سیاسی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سیاسی بحران اور دوسری جنگ عظیم کے آثار سے پورے یورپ میں جو ہلچل اور بے چینی پیدا ہو گئی اس کا اثر ان ہندوستانی طلباء پر خاص طور پر پڑا، جو یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان طالب علموں میں سجاد ظہیر بھی تھے، جو بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے لندن گئے تھے۔ طالب علموں کے اس گروہ نے آہستہ آہستہ ۱۹۳۵ء میں ایک ادبی حلقے کی شکل اختیار کر لی اس حلقے میں سجاد ظہیر کے علاوہ انگریزی زبان کے ادیب اور ناول نگار ملک راج آنند بنگالی کے ادیب ڈاکٹر جیوتی گھوش اور پرمود سین گپتا اور اردو کے ایک اور ادیب و شاعر ڈاکٹر دین محمد تاثیر شامل تھے ان سب کے ذہنوں میں ہندوستانی ادیبوں کی ایک انجمن بنانے کا خیال پیدا ہوا پہلے تو سجاد ظہیر کے کمرے میں چار پانچ نوجوان طالبعلم ملا کرتے تھے کچھ ہی دنوں میں اس ملاقات کو ایک انجمن بنانے کا خیال پیدا ہوا جس کا باقاعدہ مینی فسٹو تیار کیا گیا۔ اس انجمن کا باقاعدہ پہلا جلسہ لندن کے نان کنگ ریسٹورنٹ میں ہوا، اور انجمن کا نام ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن Indinan Progressive writers Association رکھا گیا اور ملک راج آنند کو اس انجمن کا صدر بنایا گیا۔

یہ تحریک ابھی چند انقلاب پسند نوجوان طلباء کے حوصلوں کی پیداوار تھی لیکن جلدی ہی اسے ایک ایسی تحریک سے مدد ملی، جس کی بنیاد بین الاقوامی شہرت کے حامل ادیبوں نے رکھی تھی، فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرات نے ساری دنیا کے روشن خیال اور انسان دوست لوگوں کو بیدار کر دیا تھا یہ پہلا موقع تھا جب وہ سارے ادیب ایک تحریک کی شکل میں متحد ہو گئے، جو ترقی پسند خیالات رکھتے تھے۔ انہوں نے اس کانفرنس میں یہ طے کیا کہ ادیب و شاعر کو اپنے ذاتی نہاں خانوں سے نکل کر انسانوں کے اجتماعی مفاد اور تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کے تحفظ کیلئے رجعت پسند قوتوں کے مقابل آ جانا چاہئے اور فن کو انسانیت

کی حفاظت کیلئے صرف کر دینا چاہئے۔'' (۱)

لندن میں ہندستانی ترقی پسند ادیبوں نے جو پہلا منشور تیار کیا تھا اس پر ڈاکٹر ملک راج آنند، سجاد ظہیر، ڈاکٹر جیوتی گھوش اور ڈاکٹر کے.ایس. بھٹ، ڈاکٹر ایس. سنہا اور ڈاکٹر دین محمد تاثیر کے دستخط تھے، وہ مینی فسٹو یہ ہے:

''اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ادب اور دوسرے فنون کو پجاریوں اور پنڈتوں اور دوسرے قدامت پرست اجاروں سے نکال کر عوام سے قریب تر لایا جائے، انہیں زندگی اور واقعیت کا آئینہ دار بنایا جائے، جس سے ہم اپنا مستقبل روشن کر سکیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے نئے ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہئے اور وہ ہے ہماری روٹی کا بدحالی کا، ہماری سماجی پستی کا اور سیاسی غلامی کا سوال ہم اسی وقت ان مسائل کو سمجھ سکیں گے، اور ہم میں انقلابی روح بیدار ہوگی، وہ سب کچھ جو ہم میں انتشار، نفاق اور اندھی تقلید کی طرف لے جاتا ہے قدامت پسندی ہے اور وہ سب کچھ جو ہم میں تنقیدی صلاحیت پیدا کرتا ہے اور جو ہمیں اپنی روایات کو بھی عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کیلئے اکساتا ہے جو ہمیں صحت مند بناتا اور ہم میں اتحاد پیدا کرتا اور یک جہتی کی قوت پیدا کرتا ہے اسی کو ہم ترقی پسند کہتے ہیں۔ ان مقاصد کو سامنے رکھ کر انجمن نے مندرجہ ذیل تجاویز پاس کیں۔

(۱) ہندوستان کے مختلف لسانی صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قائم کرنا، ان انجمنوں کے درمیان اجتماعوں اور پمفلٹوں وغیرہ کے ذریعے ربط تعاون پیدا کرنا صوبوں کی مرکز کی اور لندن کی انجمنوں سے قریبی تعلق استوار کرنا۔

(۲) ان ادبی جماعتوں سے میل جول پیدا کرنا، جو اس انجمن کے مقاصد کے خلاف نہ ہوں۔

(۳) ترقی پسند ادب کی تخلیق اور ترجمہ کرنا جو صحت مند اور توانا ہو جس سے ہم تہذیبی پسماندگی کو مٹا سکیں اور ہندوستان کی آزادی اور امن کی طرف بڑھ سکیں۔

---

(۱) ماخوذ از اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ص ۴۵-۴۶ خلیل الرحمٰن اعظمی ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۰۲ء۔

(۴) ہندوستان کو قومی زبان اور انڈورومن کو قومی رسم خط تسلیم کرنے کا پرچار کرنا۔

(۵) فکر ونظر اور اظہار خیال کی آزادی کیلئے جدوجہد کرنا۔

(۶) ادیبوں کے مفاد کی حفاظت کرنا اور عوامی ادیبوں کی مدد کرنا جو اپنی کتابیں طبع کرانے کے لئے امداد چاہتے ہوں۔

اس مینی فسٹو کو ہندوستان میں سب سے پہلے پریم چند نے خوش آمدید کہا اور اسے اپنے رسالہ ہنس میں شائع کر کے ایک اداریہ لکھا اس میں ان مقاصد کی حمایت اور کہا'' یہ ہمارے ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔''(۱)

**ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام**:-لندن کی انجمن نے اپنا جو مینی فیسٹو تیار کیا تھا اسے سائیکلو اسٹائل کر کے سجاد ظہیر نے ہندوستان میں اپنے دوستوں کو بھیجا اور اس بارے میں ان کی رائے دریافت کی اور اپنے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ یہ لوگ بھی اپنے دوستوں کو یہ دکھائیں اور ان کی رائے معلوم کریں ابھی یہ خط وکتابت جاری تھی کہ سجاد ظہیر بیرسٹری پاس کر کے ۱۹۳۵ء کے آخر میں ہندوستان لوٹ آئے تھے۔اسی زمانے میں ان کا قیام الہ آباد میں اپنے والد وزیر حسن صاحب کے ساتھ تھا جو وہاں جج تھے۔اس وقت الہ آباد میں احمد علی کے علاوہ فراق گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسن بھی تھے۔ ہندی کے ادیب شیودان سنگھ چوہان اور سید وقار عظیم جو اس وقت ایم.اے.کے طالب علم تھے، سبھوں نے سجاد ظہیر کی بات کی تائید کی۔ پنڈت امرناتھ جھا وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی اور ڈاکٹر تارا چند نے بھی ہمت افزائی کی۔اس طرح اس فکر وخیال کا الہ آباد میں ایک حلقہ بن گیا۔اسی زمانے میں (دسمبر ۱۹۳۵ء) میں ہندوستان اکیڈمی الہ آباد کی ایک کانفرنس ہوئی، جس میں پریم چند، مولوی عبدالحق اور جوش ملیح آبادی تشریف لائے تھے، سجاد ظہیر نے ان سے مل کر اپنے منصوبے کو ظاہر کیا ان تینوں حضرات نے ان مقاصد کی تائید کی اور اس پر اپنے دستخط کر دئے۔الہ آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل کے ساتھ ہی

---

(۱) رسالہ ہنس پریم چند بابت اکتوبر ۱۹۳۵ء۔

ہندوستان کے دوسرے شہروں میں ترقی پسند خیالات رکھنے والے ادیبوں نے اپنے یہاں انجمنیں قائم کیں علی گڑھ میں ۱۹۳۶ء کی شروعات ترقی پسند مصنفین کا پہلا جلسہ خواجہ منظور حسن کے مکان پر ہوا علی سردار جعفری اس وقت علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔انہوں نے جدید ادب اور نوجوانوں کے نام ایک مقالہ پڑھا جو علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا تھا، جس کے ایڈیٹر جاں نثار اختر تھے، ان کے علاوہ ترقی پسند خیالات کے حامل دوسرے نوجوان مثلاً حیات اللہ انصاری، مجاز، اختر رائے پوری، خواجہ احمد عباس، شاہد لطیف اور سبط حسن وغیرہ بھی علی گڑھ میں موجود تھے، جن کی بدولت نئی ادبی رجحانات کو تقویت مل رہی تھی۔

ترقی پسند تحریک نے تین چار مہینوں میں اس قدر مقبولیت حاصل کر لی کہ ملک میں ہر طرف سے اس رجحان کی تائید ہونے لگی جس میں صرف اردو کے ادیب ہی نہیں تھے بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادیب بھی دوش بدوش تھے۔ان حالات میں ان دانشوروں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ کوئی ایسی کانفرنس بلائی جائے، جہاں ملک بھر کے ادیب جمع ہوکر ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کریں۔کانفرنس بلانے والوں کے سامنے ایک طرف تو یہ مقصد تھا کہ انجمن کا دستور مرتب کر لیا جائے اور کل ہند مرکزی تنظیم مقرر کر لی جائے دوسرے یہ کہ تمام زبانوں کے ادیب جمع ہوں اور ہر زبان میں مقالے پڑھے جائیں تا کہ اندازہ ہو سکے کہ کون سے ادبی مسائل درپیش ہیں اور کون کون سے رجحانات پرورش پا رہے ہیں۔اس طور سے زبان کی مغائرت دور ہوگی اور سب کو ایک دوسرے کا تعاون حاصل ہوگا۔اس کانفرنس کی صدارت کیلئے نوجوان ترقی پسند ادیبوں کے سامنے سب سے موزوں نام پریم چند کا تھا چنانچہ سجاد ظہیر نے انہیں خط لکھا پریم چند ہی نے سب سے پہلے اس انجمن کی حمایت کی تھی۔ پھر بھی ان کی منسکر مزاجی اس عظیم منصب کو سنبھالنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی، انہوں نے سجاد ظہیر کو لکھا:

''صدارت کی بات میں اس کا اہل نہیں، عجز سے نہیں کہتا، اپنے میں کمزوری پاتا ہوں، مسٹر کنہیا لال منشی مجھ سے بہت بہتر ہوں گے یا ڈاکٹر ذاکر حسین پنڈت جواہر لال نہرو تو بہت مصروف ہوں گے ورنہ وہ نہایت موزوں ہوں گے، اس موقع پر سبھی سیاسیات کے نشے میں ہوں گے اور ادبیات سے شاید ہی کسی کو

دلچسپی ہو، لیکن ہمیں کچھ تو کرنا چاہئے۔ اگر مسٹر جواہر لال نے دلچسپی کا اظہار کیا تو جلسہ کامیاب ہوگا۔''(۱)

آگے لکھتے ہیں:

''اور کیا لکھوں تم ذرا پنڈت امرناتھ جھا کو آزماؤ انہیں اردو سے دلچسپی ہے اور وہ شاید صدارت منظور کرلیں۔''(۲)

ترقی پسند ادیبوں کی یہ کانفرنس لکھنؤ میں اپریل ۱۹۳۶ء میں رفاہ عام کلب ہال میں ہوئی، او راستقبالیہ کمیٹی کے صدر اردو کے پرانے صاحب طرز ادیب چودھری محمد علی ردولوی چنے گئے جو ترقی پسند ادیبوں کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش تھے۔ اس کانفرنس کی دو چیزیں اردو ادب کی تاریخ میں یادگار رہیں گی ایک تو مینی فیسٹو یا اعلان نامہ اور دوسرے پریم چند کا خطبہ صدارت: انجمن مینی فیسٹو یہ تھا (مقاصد انجمن)

(۱) تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشورتی جلسے منعقد کر کے اور لٹریچر شائع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

(۲) ترقی پسند مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدوجہد کر کے اہل ملک کی آزادی کی کوشش کرنا۔

(۳) ترقی پسند مصنفین کی مدد کرنا۔

(۴) آزادی رائے اور آزادی خیال کی حفاظت کی کوشش کرنا۔(۳)

پریم چند نے اپنے خطبہ میں ترقی پسند تحریک کا اصل مقصد واضح کرتے ہوئے اس کا لائحہ عمل بتایا اور آخر میں کہا:

''ہمارا مدعا ملک میں ایسی فضا تیار کرنا ہے، جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہو سکے اور نشو ونما پا سکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ادب کے مرکزوں میں ہماری انجمن قائم ہوں اور وہاں ادب کے رجحانات پر باقاعدہ چرچے ہوں مضامین پڑھے جائیں مباحثے ہوں تنقیدیں ہوں جب ہی وہ فضا تیار ہوگی، جب ادب کے نشاط ثانیہ کا

---

(۱-۲) منشی پریم چند کا خط سجاد ظہیر کے نام نیا ادب جنوری-فروری ۱۹۴۰ء۔

(۳) ماخوذ از نیا ادب جنوری فروری ۱۹۴۱ء.......................

ظہور ہوگا ہم ہر صوبے میں ہر ایک زبان میں ایسی انجمن قائم کرنا چاہتے ہیں تا کہ اپنا پیغام ہر ایک زبان میں پہونچائیں۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا، جس میں تفکر ہو آزادی کا جذبہ ہو حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے سلائے نہیں کیونکہ زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔"(۱)

**آنند نرائن ملا کا ترقی پسند تحریک سے تعلق**:- ہندوستانی زندگی کے دردوکرب کی عکاسی اور جذبہ آزادی کی ترجمانی صرف ترقی پسند شعراء یا ادباء تک ہی محدود نہیں تھی۔ اردو کے بعض دوسرے شاعر بھی ترقی پسند تحریک کے پیرو نہیں تھے، جب وطن کی شمع روشن کئے ہوئے وقت کے نئے تقاضوں کا ساتھ دے رہے تھے، ان میں خاص خاص یہ ہیں، آزاد انصاری، جگت موہن لال رواں، برق دہلوی، اقبال سہیل، نہال سیوہاروی، اثر لکھنوی، احمق پھپھوندوی، تلوک چند محروم، افسر میرٹھی اور حفیظ جالندھری وغیرہ بعد کے شاعروں میں اختر شیرانی، جمیل مظہری، آنند نرائن ملا، عرش ملسیانی، آل احمد سرور، روش صدیقی، جگناتھ آزاد اور شمیم کرہانی ان میں اکثر ترقی پسندوں میں بھی شامل ہوئے تھے، جو اس زمانے کا عام رنگ تھا۔ درس آزادی میں آزاد انصاری کا پیغام ہے:

جنس آزادی بلا قیمت نہ مانگ
جنس آزادی کی قیمت پیش کر

رواں نے "ہند مظلوم" میں ہندوستانیوں کی سوئی ہوئی غیرت کو ابھارا ہے، ان کے دلی رنج وغم، درد وکرب کی تصویر دیکھئے:

چند مظلوم زن ومرد کچھ اجڑے ہوئے گھر
سرخیاں ہیں یہ مری قوم کے افسانوں کی

اسی طرح اقبال سہیل اور نہال سیوہاروی بے باک قوم پرستوں میں شامل ہیں اقبال کی نظموں میں

(۱) ماخوذ از نیا ادب جنوری فروری ۱۹۴۱ء۔

یہ دوستی کا طلسم ٹوٹے اور منظر رخصت میں ان کی حب الوطنی نمایاں طور پر جھلکتی ہے اور نہال سیوہاروی کی نظموں وطن، ہمالیہ اور ہندوستان میں ان کے وطنی جذبات کا پرتو جھلکتا ہے۔ احمق پھپھوندوی کا مزاحیہ کلام اس دور کی شاعری میں اہم مقام رکھتا ہے۔ ان کے اشعار پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان جو سونے کی چڑیا تھا مٹی کا ڈھیلا بن گیا ہے، یہاں ساری دولت وحشمت انگریزوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے بقول حسرت موہانی:

دولت ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے
اور احمق کا یہ بھرپور طنز دیکھئے:
مرتے ہیں ہر سال فاقے سے کروڑوں آدمی
ہند پر برٹش کے احسانات تو دیکھو ذرا
تو اپنی بھوک کا شاکی فضول ہے اے ہند
مریض کو یوں ہی فاقے کرائے جاتے ہیں

آنند نرائن ملا کی انسان دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ ہندوستان فرنگیوں کے دست استبداد سے آزاد ہو اور خوش حال اور خوشی کی راہوں پر گامزن ہو آثار وقت میں وہ برٹش حکومت کی موت کا اعلان کرتے ہوئے اہل وطن کو آنے والی تبدیلیوں سے آگاہ کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اپنے ذہنی رویے سے پنڈت آنند نرائن ملا ترقی پسند ذہن رکھتے ہیں لیکن کبھی بھی انہوں نے اپنی شناخت اس ترقی پسندی کے ساتھ نہیں کی، جو ایک زمانے میں سکہ رائج الوقت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب احتشام حسین اور آل احمد سرور اور بعض دوسرے نقادوں نے ان پر ترقی پسندی کا لیبل چسپاں کرنا چاہا تو انہوں نے اس کی قطعی اجازت نہیں دی بلکہ اپنی نظم ونثر دونوں کے ذریعے انہوں نے اس کی تردید کی۔ وہ سیاست کو ادب کا حصہ ضرور سمجھتے ہیں لیکن ادب کو سیاست بنانے کے قابل نہیں۔ اس لئے

ان کی شاعری میں نہ کوئی نعرہ ہے اور نہ کوئی انقلاب کی رومانی لے، وہ اپنے حقوق کی بازیافت کے لئے تشدد کو بھی روانہیں رکھتے پھر وہ جو کچھ لکھتے ہیں پورے اعتماد سے لکھتے ہیں، اس اعتبار سے ان کی شاعری ترقی پسند تحریک کے اس منشور کی خلاف ورزی نہیں کرتی، جو اپریل ۱۹۴۶ء میں جاری ہوا تھا۔ بقول ڈاکٹر خلیق انجم صاحب:

''غالب کا یہ مصرعہ:

''ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم''

ملا صاحب کیلئے محض شاعرانہ خیال نہیں بلکہ عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی فکر و بصیرت کائناتی ہے، ان کا ایک فلسفہ اور ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی نظریہ ہے اور وہ ہے انسان دوستی کا وہ انسان کو کل حیثیت سے دیکھتے ہیں اسے جغرافیائی اور مذہبی خانوں میں تقسیم نہیں کرتے۔ انہوں نے شاعری میں یہ عقیدہ محض روایتی مضمون کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ یہ عقیدہ ان کی گفتار اور کردار دونوں سے ہم آہنگ ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تجھے مذہب مٹانا ہی پڑے گا روئے ہستی سے
ترے ہاتھوں بہت توہین آدم ہوتی جاتی ہے
ہر دیر و حرم سے کترا کر ملا آیا میخانے میں
ملا کے سے دنیا میں سلجھے ہوئے انساں کتنے ہیں
بشر کے ذوق پرستش نے خود کئے تخلیق
خدا د کعبہ کہیں اور کہیں صنم خانے (۱)

---

(۱) جادہ ملا ص ۲۱ مرتبہ خلیق انجمن انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۹۸ء۔

# باب سوم

# ملا بحیثیت غزل گو

پنڈت آنند نرائن ملا لکھنوی قدیم تہذیب کے پروردہ ہیں۔موصوف کا لکھنوی تہذیب وتمدن، ثقافت اور شاعری سے متاثر ہونا ایک فطری امر ہے ابتدائے بیسویں صدی میں لکھنؤ کی تہذیب وشاعری حسن وشائستگی اور لکھنوی رکھ رکھاؤ کچھ نہیں باقی رہ گیا تھا، جس کی مثالیں دور نوابین میں دیکھنے کو ملتی تھیں لیکن پھر بھی بہت کچھ اثرات اب بھی لکھنؤ کی مٹی میں سرایت کئے ہوئے ہیں، جس طرح پہلے کبھی تھی قدریں ضرور دم توڑ رہی تھیں لیکن ابھی قدر دانی باقی تھی ان بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی وتہذیبی ماحول میں شاعری کی شکل بہت کچھ بدل گیا تھا لیکن اس شاعری میں لکھنؤ کے ادبی ماحول کا عکس ضرور ملتا ہے۔آنند نرائن ملا نے اسی ماحول میں آنکھیں کھولیں اس لئے ان کے بعد کے شعراء کا مطالعہ کرنے سے پہلے لکھنؤ اور لکھنوی شاعری کی چند بنیادی خوبیوں کا ذکر ضروری محسوس ہوتا ہے۔

عہد آصف الدولہ ہی سے لکھنؤ علم وفضل اور فنون لطیفہ کا مرکز بن گیا تھا.......... دور دراز سے صاحب علم وکمال، شاعر وادیب، موسیقی کے ماہر، زبان داں اور ماہرین طب یہاں کا عروج دیکھ کر یہاں کھینچ کر چلے آئے تھے اور یہیں بس گئے تھے۔ یہ بات نہیں ہے کہ لکھنؤ میں علم وکمال کی قندیلیں باہر سے درآمد شدہ تھیں خود لکھنؤ میں ایسے اہل دانش اور ہر فن کے ماہر پیدا ہوئے، جنہوں نے نہ صرف لکھنؤ کے نام کو روشن کیا بلکہ لکھنؤ سے باہر بھی اپنی روشنیاں بکھیریں لیکن غدر ۱۸۵۷ء نے لکھنؤ شہر کی تہذیب وتمدن کا سارا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تھا شرفائے لکھنؤ اور عمائدین شہر نے حتی الوسع اپنی وضع داریوں پر آنچ نہ آنے دی لیکن تابہ کے شہر کے ہر محلے گلی کوچے عمائدین شہر وعام شہریوں سے آباد تھے، بڑی بڑی کوٹھیاں حویلیاں

ڈیوڑھیاں بارونق تھیں، ہر شام شرفاء ان میں اکٹھا ہوتے، سامان رونق جیسے مجرا، بھانڈوں کے طایفے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور اس طرح شہر کی رنگا رنگی میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ یہ فارغ البالی کا دور تھا کہیں داستان گوئی تو کہیں مشاعرے تسکین ذوق کا سامان فراہم کرتے ہیں کہیں خدام اور خوشامدیوں کے جملے واہ میاں واہ واہ جی حضور، جی میاں صاحب کی آوزیں بلند ہوتی رہیں۔ ہندو مسلمان میں اتحاد اور میل جول تھا، امراء میں مسلمان اور ہندو دونوں تھے، وضع داری رہن سہن لباس زبان گفتگو سب ہی کے ایک جیسے ہوا کرتے تھے، کبوتر بازی، پتنگ بازی، بٹیر بازی، سب ہی کا عام مشغلہ تھا، میلوں ٹھیلوں کا رواج تھا اس زمانے میں صرف عمائدین تک ہی نہیں بلکہ عوام لکھنؤ میں ہر طرح کی اخوت ہمدردی اور انسانیت تھی، ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آتا، اپنا مذہبی اور اخلاقی فرض سمجھتے تھے سب ہی کی زبان فارسی تھی۔

بقول مرزا جعفر حسین:

''.................. یہ کلچر صداقت اور انسانیت کی مقدس بنیادوں پر استوار تھا جب اس کلچر کے پرستار اٹھ گئے تو لکھنؤ کی اصل ثقافتی زندگی بھی فنا کے گھاٹ اتر گئی۔''(۱)

زمانہ بدلنے سے کلچر بھی بدلا اب نہ وہ رنگ رلیاں رہیں نہ میلے ٹھیلے نہ رقص سرور کی محلفیں رہیں نہ شعراء اور داستان گو جو اپنے فن میں منفرد ہوتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ سننے والے بھی نہیں رہ گئے تھے، رفتہ رفتہ لکھنوی تہذیب و ثقافت تبدیلی زمانہ کے ساتھ ختم ہو گئی۔

دہلوی شاعری اور لکھنوی مزاج شاعری پر نظر غائر ڈالیں تو سمجھ میں آتا ہے کہ دلی ہمیشہ سے سیاسی آماجگاہ بنی رہی۔ متواتر باہری حملوں سے زیادہ تر تباہیوں کا شکار رہی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کبھی اسے مستقل طور پر معاشی استحکام نصیب نہ ہوسکا، جس کی فطری طور پر ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ شعرائے دہلی ترک وطن پر مجبور ہوئے میر تقی نے اپنی اس مجبوری کا ایک مصرعہ میں یوں اشارہ کیا ہے، جس میں دہلی کی پوری فضا محسوس ہوتی ہے، سمٹ کر آ گئی: ع -'' یہ مانا دلی میں رہے کھائیں گے کیا'' اسی فکر و

(۱) بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں ص ۶ مرزا جعفر حسین اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۷۹ء۔

احساس کی سلگتی بھٹی میں ان کا تخیل پروان چڑھا، اسی کرب نے ان کی شاعری کو داخلی حالات کا ترجمان بنا دیا۔ اس کے برعکس لکھنؤ کی گرم بازاری اور رونقیں عروج پر تھیں، فکر معاش سے بے نیازی امراء ورؤساء ونوابین کی سرپرستیوں نے ہر دل میں اپنی جگہ بنادی ہے دہلی میں آہ کے دھوئیں بلند ہو رہے تھے، اسی زمانہ میں لکھنؤ میں واہ واکا شور وغوغا تھا، یہ نتیجہ تھا دہلی کی تباہی اور لکھنؤ کی مرفہ مالی کا چنانچہ لکھنوی فضا شعراء وادباء کو بہت راس آئی، ہر طرف سکون آسودگی، چین اور اطمینان تھا اس لئے داخلی میلانات پر توجہ کم سے کمتر رہی اور خارجی میلانات وعناصر نے اردو شاعری میں جگہ بنالی، جس کے اثرات نمایاں طور پر لکھنوی شاعری میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

لکھنوی شاعری کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں زبان اپنے عروج پر پہونچ گئی، انیس ودبیر، آتش وناسخ نے زبان وبیان کو معراج کمال عطا کیا۔ لکھنؤ کی شاعری میں جنسی معاملات کی برملا ترجمانی الفاظ کی بازیگری رعایت لفظی کی بھرمار اور صنعتوں کی بھرپور عکاسی کی گئی، شاعری فطری ماحول کی ترجمان ہوتی ہے، دلی کے مقابلے میں لکھنؤ کی فضا زیادہ پرسکون تھی، دلی اجڑنے کے بعد اکثر شعراء لکھنؤ سمٹ کر آگئے، ان کی درآمد زبان اور لکھنوی تہذیب کے پرتو میں لکھنؤ شاعری پروان چڑھنے لگی۔ ناسخ نے اصلاح زبان درستگی الفاظ محاورے پر عملی قدم اٹھایا اور زور دیا۔ اسی اصلاح کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان فصیح ہوگئی، مرثیوں کے حوالے سے انیس ودبیر نے اسے نقطہ عروج پر فائز کردیا۔ اسی کے دوش بدوش بے فکری اور ہنسی و ٹھٹھول کے ماحول نے خیال آرائی رعایت لفظی اور ابتذال بھی لکھنوی شاعری میں گھر کر گئے، عوام شعراء اور روساء تک ہی اسے ہی شاعری کی جان تصور کرنے لگے، لیکن انیسویں صدی میں آزاد اور حالی کی اصلاحی کوششوں اور سرسید کی ادبی تحریک نے بدلتے ہوئے حالات اور انگریزی زبان وشعر کے اثرات نے شعر کا مزاج بدلنا شروع کیا اور ارادی طور پر شاعری کو سادہ اور فطری انداز میں پیش کیا جانے لگا۔ فکر وتخیل کے ساتھ جذبات واحساسات دل کی ترجمانی بھی دلکش پیرایۓ میں کی جانے لگی ان شعراء میں جلال لکھنوی، صفی، عزیز، ثاقب، حسرت، آرزو، فانی، اثر، اصغر، افسر اور پنڈت آنند نرائن ملا کے اسماء قابل ذکر

ہیں، ان شعراء نے اردو غزل میں ایک نئی روح پھونکی۔ زبان میں سوز وگداز لچک، سنجیدگی ومتانت تخیل کی بلندی، تہذیب وشائستگی، تاثیر ترنم اور درد پیدا کیا اور غزل کو انتہائے کمال پر فائز کردیا۔ حالی نے مقدمہ شعروشاعری کے ذریعے غزل اور نظم کی اصلاح کی ہر کوشش عملی طور پر کی۔ رائج الوقت رجحان شاعری کو بدلنے اور غزل کو بکارآمد صنف سخن بنانے کی سعی جمیل کی۔ ان کی اس فکر اصلاح کو قدامت پسندوں نے یکسر نظرانداز کیا۔ اکثر تو اوچھے جملوں تک سے باز نہ آئے، اس کے علاوہ اس دور کے اخبار ورسائل مثلاً اودھ اخبار، ریاض الاخبار، بہار پنچ، شیر مشرق، اور دوسرے رسائل وجرائد کے ذریعے حالی کی آواز کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا، خاص کر اودھ پنچ اس مخالفت میں سرفہرست تھا۔

بقول ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی:

''ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے(۱)

لکھنوی تہذیب کے دلدادہ شعراء کا یہ وصف خاص تھا کہ وہ اپنے ماحول اور گردوپیش کے ہی کوائف پر نظر رکھتے اور اسے ہی اپنی شاعری کا موضوع بناتے تھے، وہ عالمی ادب اور معاشرے پر ہونے والی تبدیلیوں سے سروکار نہیں رکھتے تھے، بقول پروفیسر آل احمد سرور:

''حالی نے زمانے کی رفتار پر چلنا سکھایا تھا، زندگی کی تلخیوں اور حقیقتوں کا احساس دلایا تھا، شاعری کو انسانیت کا علمبردار بنانے کی کوشش کی تھی ان کی یہ کوشش بارآور ہوری تھی ''مخزن'' میں جدید طرز کی نظمیں لکھی جارہی تھیں، وطن کی محبت، مناظر قدرت، ماحول کی عکاسی، قومی اور سیاسی بیداری انگریزی نظموں کے ترجمے سب کچھ ملنے لگے۔''(۲)

ملا کے سن ولادت ۱۹۰۱ء تک اردو غزل اور نظم میں نمایاں تبدیلیاں ہوچکی تھیں، سرسید تحریک اور حالی اور آزاد کی اصلاحی کوششوں نے اردو شاعری میں ایک انقلاب سا پیدا کردیا تھا اس زمانے میں صفی، عزیز

(۱) حالی بحیثیت شاعر ص ۲۸۲ از ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی۔
(۲) نئے اور پرانے چراغ ص ۲۳۳ پروفیسر آل احمد سرور سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۶۳ء۔

اور ثاقب وغیرہ نے رفتار زمانہ کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے انوکھے انداز اور دلکش پیرائے اظہار کے ذریعے قدیم اور فرسودہ روایات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اردو شاعری کو میر وغالب کے انداز شاعری کے ہم پلہ بنانے کی کوشش کی اس ضمن میں یہ حقیقت نا قابل فراموش ہے کہ اردو غزل کو مقبولیت شعری نشستوں اور مشاعروں سے ملی۔ یہ مشاعرے اور نشستیں لکھنؤ میں مختلف انجمنوں کے زیر اہتمام برابر ہوا کرتی تھیں۔ صفی لکھنوی نے سب سے پہلی انجمن معیار ادب ۱۸۸۹ء میں تشکیل دی اور کافی عرصے تک اس کے زیر اہتمام مشاعرے ہوتے رہے اس انجمن کے بعض ممبروں نے معین الادب، معراج ادب، بہار ادب جیسی دوسری انجمنیں بھی قائم کیں، اسی طرح مشاعروں کا رواج بڑھتا گیا وہ لکھنؤ کے مشاعروں کا آنکھوں دیکھا حال مرزا جعفر حسین لکھتے ہیں:

''لکھنؤ کے پرانے مشاعرے تاریخی حیثیت کے مالک تھے، اور ہر اعتبار سے لکھنؤ کے مخصوص طرز معاشرت کے حامل ہوتے تھے، یہ مشاعرے بعد نماز مغرب شروع ہوتے اور نماز صبح کے اول وقت ختم ہو جایا کرتے تھے، جو شاعر شام کو جس طرح آ کر بیٹھ جاتا تھا اسی طرح صبح تک بیٹھا رہتا تھا، اس زمانے میں پہلو بدلنا بھی عیب سمجھا جاتا تھا۔ ہر شاعر کے پڑھنے کا اپنا علاحدہ علاحدہ انداز تھا، مشاعرے کی ابتدا اور انتہا بانی محفل کی غزل پر ہوا کرتی تھی، ابتداء میں طرحی غزل پڑھی جاتی تھی اور آخر میں چند اشعار سنا کر رسم پرستی یا وضع داری مکمل کر دی جاتی تھی۔'' (۱)

لکھنؤ میں یہ مشاعرے تہذیب وتمدن کا اہم جزو تھے، ان کی دیکھا دیکھی سیکڑوں ادبی انجمنیں وجود میں آ گئیں گھر گھر مشاعرے ہونے لگے یہ انجمن معیار الادب اور رسالہ معیار ہے کا فیضان تھا کہ لوگ شاعری میں حقیقت نگاری اور جذبات نگاری کی طرف مائل ہوئے اور جدید تعلیم یافتہ افراد نے انہیں تقویت پہونچائی، معین الادب کے ایک گروپ نے معراج ادب قائم کر رکھی تھی۔ بہار لکھنوی کے انتقال کے بعد معراج ادب اور معین الادب کو مدغم کر کے ایک نئی انجمن بہار ادب بنائی گئی۔ پنڈت آنند نرائن ملا بہار دب

(۱) بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب مرزا جعفر حسین ۱۳۳ یوپی اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۷۹ء۔

کے پہلے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے ان کی کوششوں سے شعرا کا وہ گروپ جو عزیز گروپ کہلاتا تھا اور جس نے بہار ادب کو تسلیم کرنے کے بجائے معین الادب کو قائم رکھنے کا فیصلہ کیا تھا شعراء کا یہ گروپ بھی بہار ادب میں شامل ہو گیا۔ اس میں یہ طے ہوا کہ ایک سال پنڈت آنندنرائن ملا رہیں گے اور دوسرے سال سید آل رضا (شاگرد آرزو لکھنوی) ہوں گے اس کا خوشگوار نتیجہ یہ ہوا کہ جو جنرل سکریٹری ہوتا اس کوشش میں کہ اس کے زمانہ کردگی میں ایسا کوئی کام ہو جائے جو پہلے نہیں ہوا تھا چنانچہ اس مہم کی یادگار وہ مشاعرے ہیں، جن میں ایک محفل شعر ونغمہ ہے، جہاں ہندوستان بھر کے مشہور و معروف شعراء اور اساتذہ کو دعوت شرکت دی گئی اور ایک رات قیصر باغ کی بارہ دری میں ایسا عظیم الشان مشاعرہ ہوا، جو پھر دیکھنے میں نہ آیا۔"(۱)

بہار ادب کے بعد فردوس ادب کا بھی خاصا عروج رہا اور پھر مشاعروں کی بزم نے مرکزی حیثیت اختیار کر لی فردوس ادب کے وہ مشاعرے یقیناً یادگار ہیں، جو یوم ناسخ، یوم آتش، یوم خواجہ وزیر، یوم چکبست اور یوم آسی کے نام سے موسوم ہوئے۔"(۲)

اس ذکر سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ صفی لکھنوی نے غزل کو جدید رجحانات سے ہم آہنگ کر کے جس انجمن کا آغاز کیا تھا وہ ملا صاحب کے بہار ادب کے بعد دھیرے دھیرے انجمنوں کا وجود ختم ہونے لگا۔ یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ بہار ادب کو بہار لکھنوی نے قائم کیا تھا اس کے سرگرم رکن سراج لکھنوی اور پنڈت آنندنرائن ملا تھے۔ زبان وبیان کی وہ ساری خوبیاں جو اس زمانے میں لکھنوی شعراء کا طرہ امتیاز تھا آنندنرائن ملا کی شاعری خاص وصف تھا ایک افسوس ناک حقیقت ان انجمنوں کے سلسلے میں یہ ہے کہ جلدی جلدی انجمنوں کا بننا اور بگڑنا اس وقت کے شعراء کا آپسی اختلاف تھا اور یہ کہ شعراء ایک دوسرے سے رشک وحسد کا بھی شکار تھے، لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ ان ادبی انجمنوں کے ذریعے اردو شعر وادب میں گرانقدر اضافے ہوئے اس کے بعد ایسی ادبی سرگرمیاں جو ان انجمنوں کے دم سے تھیں نہ صرف لکھنؤ سے ختم ہوئیں بلکہ پورے ہندوستان میں ختم ہو گئیں۔

---

(۱) بحوالہ حرف ناتمام عمر انصاری نامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۸ء۔
(۲) بحوالہ حرف ناتمام عمر انصاری۔

حالی، آزاد اور اکبر سے آگے بڑھ کر سرور جہاں آبادی، چکبست لکھنوی تک اردو شاعری نے جو ترقی کی اس میں کسی نہ کسی پہلو پر سرسید اور ان کے رفقائے کار کا ہاتھ تھا۔ اس اعتبار سے یہ کہنا بجا ہے کہ اردو شاعری پر سرسید کا یہ بہت بڑا احسان ہے سرسید کی تحریک نے ادب کو جدید فکر و شعور اور تہذیب و شائستگی سے روشناس کرایا۔ اس تحریک کے بعد اردو ادب میں ایک ایسی نئی تحریک نے ابھر کر نہ صرف اندرون ملک بلکہ عالمی سطح پر اپنے گہرے اثرات مرتب کئے، اگر یہ کہا جائے کہ علیگڑھ تحریک کے اثرات سے اردو زبان وادب کی نشاط ثانیہ کا آغاز ہوا شاید غلط نہ ہوگا۔ اسی دور میں جب ترقی پسند تحریک اپنے پورے شباب پر تھی فرانسیسی شاعری سے متاثر ہو کر میراجی اور ن.م. راشد نے اشارات اور ابہام ہیئت اور اسلوب میں نمایاں قسم کے کامیاب تجربے کر کے ایک طرز شاعری کی بنیاد ڈالی اردو شعراء نے مغربی فکر و شعور سے کسب فیض کیا اور اس دائرے میں اپنی شاعری کو فروغ دیا۔ انہوں نے شاعری میں تمثیل نگاری، امیجری، جدت پسندی اور نئی نئی علامتوں کو فروغ دیا۔

جدید شاعری کے اس دور میں جب شاعری میں نئے نئے تجربات کئے جا رہے تھے، آزاد نظم معریٰ نظم نگاری اپنے شباب پر تھی، اور ترقی پسند مصنفین نے جذبات کی شدت اور بہاؤ میں اردو نظم نگاری کو نئے اسالیب عطا کئے، ان حالات میں ایسا محسوس ہونے لگا کہ شاید اب اردو غزل قصہ پارینہ بن جائے گی، اسی زمانے میں میر و غالب، حالی، اقبال و اکبر کی اعلیٰ روایات کو قائم رکھتے ہوئے حسرت، جگر، فانی، اصغر، فراق اور آنند نرائن ملا نے شعوری طور پر غزل کو جدید میلانات اور رجحانات سے روشناس کرایا۔ ان شعراء نے حیات انسانی کے خارجی اور داخلی عوامل کو ان محسوسات کی روشنی میں اسی فنکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ پیش کیا اور غزل کو ایسے مقام پر فائز کر دیا کہ غزل میں میر، غالب، مصحفی، سودا، حالی اور اقبال کی روایت تازہ ہوگئی۔ اس دور میں غزل میں رمز و ایمائیت، زبان و بیان کی شگفتگی نئی نئی تشبیہات و استعارات عصر آگہی، خارجی اور داخلی محسوسات کی بھرپور عطا سی کی گئی۔

اسی کے ساتھ اردو ادب میں ایک نئی تحریک رومانوی تحریک کے نام سے ترقی پسند ادبی تحریک اور

ترقی پسند تحریک کے دوران پروان چڑھی اس تحریک نے اردو کی کلاسیکی روایات سے روگردانی کر کے ایک الگ طرز فکر کی بنا ڈال۔ بقول پروفیسر محمود الٰہی:

''ہمارے یہاں جب مغربی ادبیات کا مطالعہ عام ہوا تو اس کی روشنی میں ہم نے کچھ مصطلحات کچھ فارمولے کچھ اصول ترک کر دئے اور کچھ اپنا لئے ان میں سے ایک رومانٹیزم بھی ہے، جسے اردو میں رومانیت یا رومانویت کہا جاتا ہے۔''(۱)

آزادی سے پہلے جدید شاعری نظم اور غزل دونوں اصناف میں نمایاں مقام حاصل کر چکی تھی، ویسے بھی ۱۹۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ انتہائی ناسازگار تھا، پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۷ء کا انقلاب روس ترقی پسند ادبی تحریک دوسری عالمی جنگ اور پھر ہندوستان کی سیاست میں آزادی کی لڑائی کا شدت اختیار کرنا اور آخر میں سب سے زیادہ لرزہ خیز تقسیم کے وقت خوں چکاں فسادات کا پھوٹ پڑنا، بھوک افلاس بے روزگاری اور بے یقینی ہمارے سماج کے اندر گھن کی طرح سما چکے تھے۔ تشدد و فرقہ پرستی کے عفریت اس ملک کی تہذیب رواداری امن و چین کو نگل لینے کے درپے تھے، یہ وہ روح فرسا حالات تھے، جن سے سماج کو سب سے زیادہ حساس افراد یعنی شعراء کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ آزادی کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا، اور طرح طرح کے نئے مسائل اور نئی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں، چنانچہ ان سب حالات سے متاثر ہو کر اقبال، سہیل و جگر، جوش، آنند نرائن ملا، ساغر، روش، سردار جعفری، اختر الایمان، جاں نثار اختر، وامق، فکر تونسوی، ساحر لدھیانوی، شاد، بلراج کومل، جذبی اور جگن ناتھ آزاد وغیرہ نے جس کرب و بے چینی سے حالات کا ذکر کیا ہے اس کی مثال شاید اردو کے بعد دوسرا ادب نہ پیش کر سکے۔ اس دور میں عالمی صورت حال بیشتر ایشیائی ملکوں میں آزادی کی تحریک، استعاریت کے خلاف آواز اٹھانے میں اردو شعراء سب سے پیش پیش رہے، فراق آنند نرائن ملا، جاں نثار اختر، سردار جعفری، کیفی اعظمی، نریش کمار شاد نے چینی جارحیت کے خلاف شعرائے اردو کا یہ رویہ صرف حصار غزل تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اس دور میں نظم کی

---

(۱) رومانی تحریک پروفیسر محمود الٰہی ضمیمہ قومی آواز ۴؍ دسمبر ۱۹۸۸ء۔

ہیئت میں اور اس کی تکنیک میں بھی تبدیلی ہوئی۔ آزاد نظم کے ذریعے بھی ہمارے شعراء نے اپنے خیالات ومحسوسات کو ذاتی کرب اور اجتماعی کرب کا وسیلہ بنایا اور علامتی نظموں کے پیرایے میں اپنے محسوسات کا اظہار کیا جانے لگا۔ ساحر، منیب الرحمٰن، اختر الایمان، سلام مچھلی شہری، فراق، آنند نرائن ملا نے اپنے فکروفن کو آزاد نظم کا پیکر عطا کرنا شروع کیا۔ آزادی کے بعد ایک پوری دہائی تک بے چینی و بے اطمینانی، کرب وانتشار، بدنظمی وقتل وسفاکی کی ایک لہر سی سماج میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ بقول کیفی اعظمی:

لوگ گھر سے نکلتے ڈرتے ہیں
راستے سائیں سائیں کرتے ہیں

ان حالات سے متاثر ہو کر غزل نے ایک نئی کروٹ لی اور ترقی پسند مصنفین کے دور میں غزل سے جو انحراف پیدا ہو چکا تھا اس سے بالکل مختلف انداز میں غزل کو اپنے پورے بانکپن کے احیا سے تعبیر کیا جا سکتا ہے مجاز، ساحر، جگناتھ، آزاد، وجد، فراق، پنڈت آنند نرائن ملا، جگر، نشور واجدی، اختر انصاری، جاں نثار اختر، نشور واجدی، مجروح، اثر مظہر امام وغیرہ کے اسماء لائق ذکر ہیں۔

اس دور میں غزل ایک نیا آہنگ لئے ہوئے ہے اس میں جوش وولولے کے ساتھ فکروفن کا بہترین امتزاج ہے البتہ غزل کی نرمی حلاوت اور دھیمے پن کا عکس دھندلا سا گیا ہے۔ بھاری بھرکم آواز، ایمائیت رمزو کنایہ بھی اس دور کا مزاج خاص ہے، جس سے غزل نے اپنے روپ کو سنوارا اس کے ساتھ ساتھ ملا کو ہمیشہ یہ احساس کہ ان کی فکری جولانگاہ حالات حاضرہ کا احاطہ کرتی بھی ہے یا نہیں یا ان کا اپنے فن کے وسیلے سے سماج سیوا، اور ملکی مسائل پر بھی انہوں نے کچھ توجہ صرف کی ہے۔

بدلتی قدروں میں کچھ ہوں کہ کچھ نہیں ملا
سوالیہ سا نشان ہوں خود اپنے نام کے بعد

ڈاکٹر خلیق انجم کا یہ تجزیہ صد فیصد درست ہے کہ:

''اپنے ذہنی رویہ کے اعتبار سے ملا صاحب سو فیصدی ترقی پسند ہیں لیکن انہوں نے بھی اپنی شناخت

اس ترقی پسندی کے ساتھ نہیں کی، جو ایک زمانے میں سکہ رائج الوقت بن چکی تھی یہی وجہ ہے کہ سید احتشام حسین، آل احمد سرور اور بعض دوسرے نقادوں نے ان پر ترقی پسند کا لیبل چپکانا چاہا تو انہوں نے اس کی قطعی اجازت نہیں دی بلکہ اپنی نظم ونثر دونوں کے ذریعے اس کی تردید کی وہ ادب کو سیاست کا حصہ ضرور سمجھتے ہیں لیکن ادب کو سیاست بنانے کے قائل نہیں ہیں اس لئے ان کی شاعری میں نہ کوئی نعرہ بازی ہے اور نہ ان کے یہاں انقلاب کی کوئی رومانی لے ہے وہ اپنے حقوق کے اصول کیلئے تشدد کے بھی قائل نہیں لیکن پھر بھی شاعروں کے بارے میں ان کا ایک موقف ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں پورے اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں اس اعتبار سے ان کی شاعری ترقی پسند تحریک کے اس منشور کی خلاف ورزی نہیں کرتی جو ۱۹۳۶ء میں جاری ہوا تھا۔"(۱)

غالب جن سے ملا نے سب سے زیادہ کسب فیض کیا ان کا مصرعہ ہے "ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم" ملا صاحب کیلئے یہ محض شاعرانہ خیال نہیں ہے بلکہ ان کا عقیدہ ہے ان کی فکر وبصیرت کائناتی ہے ،ان کا ایک فلسفہ اور ایک عقیدہ ہے انسان نوازی اور انسان دوستی، اور انسانیت کو جغرافیائی یا مذہبی خانوں میں نہیں بانٹا جاسکتا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اس بابت جو کچھ کہا، ان کا قول وعمل اس کا شاہد ہے اور وہ ہمیشہ اس اصول پر کاربند رہے چند اشعار دیکھئے:

تجھے مذہب مٹانا ہی پڑے گا روئے ہستی سے
ترے ہاتھوں بہت توہین آدم ہوتی جاتی ہے
ہر دیروحرم سے کترا کر ملا آیا میخانے میں
ملا کے سے لیکن دنیا میں سلجھے ہوئے انساں کتنے ہیں

پنڈت آنند نرائن ملا نے شاعری کی شروعات لکھنؤ میں اس زمانے میں کی تھی، جب یہاں صفی، عزیز، ثاقب جیسے اساتذہ کا سکہ رائج تھا، یہ وہ زمانہ تھا، جب غزل ہی سب سے زیادہ مقبول صنف سخن تھی اور حسن

---

(۱) پیش لفظ جادہ ملا ص ۲۰ ڈاکٹر خلیق انجم انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔

وعشق کے روایتی مضامین ہی غزل کے خاص موضوعات تھے، لکھنؤ میں ملا صاحب سے کچھ پہلے چکبست ایسے شاعر تھے، جن کی شاعری میں بیسویں صدی کے ابتدائی پندرہ بیس سال کے ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی کی عکاسی ملتی ہے اس لحاظ سے لکھنؤ میں چکبست کے بعد دوسرا نام ملا کا ہے، جنہوں نے اپنی شاعری کے وسیلے سے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک زندگی اور انسانیت کی کھل کر ترجمانی کی۔ ان کی شاعری کا افق نہایت وسیع ہے اور تنوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔

بقول ڈاکٹر خلیق انجم:

''ملا صاحب کی شاعری صرف ایک فرد واحد کی آواز نہیں بلکہ یہ اس پورے عہد کی صدائے بازگشت ہے، جس میں ملا صاحب جی رہے ہیں، ملا صاحب کے دور کا اجتماعی شعور ان کی شاعری کا سب سے نمایاں آہنگ ہے، اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ملا صاحب کی شاعری اردو کی تمام صالح روایتوں کی امین بھی ہے اور عصری زندگی کے تقاضوں سے ہمکنار بھی ہے۔ انہوں نے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے لیکن فرسودگی سے دامن بچاتے ہوئے اپنا تخلص سفر طے کیا ہے اس لئے وہ اپنے عہد کے فکری اور فنی تقاضوں سے منحرف نہیں ہیں۔ ملا صاحب نے اپنے طویل تخلیقی سفر میں غزل کو بری طرح معتوب ہوتے بھی دیکھا اور اسے ایک نئی زندگی کے ساتھ دوبارہ زندہ ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس پورے سے عرصہ میں غزل کے ساتھ ان کی مستقل اور غیر مشروط وفاداری ان کے سلیم الطبع ہونے کی دلیل ہے اس لئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس دور میں جن شاعروں نے غزل کو نئے تیوروں سے سجایا ان میں ملا صاحب بھی ایک ہیں۔ غزل کو مخاطب کرتے ہوئے ملا صاحب کے یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

دلہن تھی تجھے میں نے ساتھی بنایا
شبستاں سے میدان میں کھینچ لایا
ترے نرم لہجے کو للکار دے دی
ترے دست نازک میں تلوار دیدی

دیاد رد انساں کا احساس تجھ کو
کھڑا کردیا نظم کے پاس تجھ کو

غزل کے بارے میں ملا صاحب کی ایک مسلسل غزل کے چند اشعار بھی دیکھئے:

غزل محفل میں تیری پینے والوں کی کمی کب تھی
مگر ان پینے والوں میں مری شائستگی کب تھی
لب ورخسار کے قصے نگاہ و دل کے افسانے
تیرے ہونٹوں پہ لیکن آیت پیغمبری کب تھی
شعور اجتماعی ثبت جس پر خاص مہریں تھیں
تری حد تھی تجھے حاصل یہ انساں آگہی کب تھی
غزل اک نام تھا ناکامیوں کا سینہ کوبی کا
مرے پہلے یہ بانگ کاروان زندگی کب تھی (۱)

ملا صاحب کی شاعری ایک انسان دوست کی شاعری ہے، بقول ڈاکٹر خلیق انجم:

''ایک ایسے دردمند انسان کی شاعری جس پر امیر مینائی کے اس مصرعہ کا ''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے'' بھرپور اطلاق ہوتا ہے انسان دوستی کی باتیں یوں تو بہت سے شعراء نے کی ہیں لیکن اسے مسلک کے طور پر اپنانے والوں میں غالب کے بعد شاید سب سے نمایاں نام ملا صاحب کا ہے۔'' (۲)

ملا صاحب انسانیت کو کل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، اسے جغرافیائی اور مذہبی خانوں میں تقسیم نہیں کرتے، بیسویں صدی کے نصف اول میں برطانوی سامراج ہندوستانی سیاست کو ہندو اور مسلم سیاست میں تقسیم کرنے میں کامیاب ہوگیا اس فرقہ پرست سیاست کا سب سے بڑا مرکز اوراتر پردیش تھا، جہاں ملا صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ گذرا تھا، لیکن فرقہ پرستی کی ہوائے تند و تیز میں بھی ملا صاحب کے پائے

(۱-۲) جادہ ملا پیش لفظ محررہ خلیق انجم ص ۱۰-۱۱۱ انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۸۸ء۔

استقلال میں ذرا سی بھی لغزش نہیں آئی اور انہوں نے ہر طوفان بلاخیز میں بھی شمع انسانیت کو جلائے رکھا، اور بڑے سے بڑے منافع کے لئے بھی انہوں نے اپنے اصولوں اور خوابوں کا سودا نہیں کیا، انہوں نے ''میری حدیث عمر گریزاں'' کے دیباچے میں لکھا ہے:

''میں شاعر کو صرف فنکار نہیں سمجھتا بلکہ دانائے راز اور پیغمبر بھی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک کوئی شاعر یا افسانہ نگار نوع انساں سے محبت کئے بغیر عظیم نہیں ہوسکتا اور نہ وہ ادب عالیہ پیش کرسکتا ہے۔ نوع انساں سے اس طرح محبت کرنے والا اجتماعی مفاد کو انفرادی آسودگی پر قربان کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا اور اس کی زندگی اور پیام میں بھی کوئی اس قسم کا تضاد پیدا نہیں ہوسکتا............ میرا اپنا عقیدہ تو یہی ہے کہ جس ادب میں انسانی درد کی آواز نہیں وہ زیادہ سے زیادہ ذہنی عیاشی کیلئے سامان مہیا کرسکتا ہے لیکن دل ودماغ کی تربیت نہیں کرسکتا۔ کلام میں تاثیر خلوص سے پیدا ہوتی ہے اور عظمت انسانی درد کی آواز شامل کرنے سے وہی شاعر ادب عالیہ پیش کرسکتا ہے، جس میں یہ دونوں باتیں موجود ہوں۔''(۱)

آنند نرائن ملا اردو کے معاملے میں صرف گفتار کے غازی نہیں ہیں بلکہ کردار وعمل کے بھی غازی ہیں، وہ اردو تحریک کے بھی قافلہ سالاروں میں رہے ہیں دس سال تک وہ ہندوستان کے سب سے بڑے ادارے یعنی انجمن ترقی اردو ہند کے صدر رہے وہاں انہوں نے مرکزی اور صوبائی حکومت کے ذمہ داریوں کو بہت سے میمورنڈم پیش کئے اور انہوں نے اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف زوردار آواز بلند کی۔ انہوں نے اردو کے جائز حقوق کیلئے مطالبئے کئے۔ اندر کمار گجرال کی صدارت میں مرکزی حکومت کی قائم کردہ کمیٹی برائے فروغ اردو کے سامنے اردو کے سلسلے میں ملا نے جس مدلل طریقے سے اردو معاملہ پر بحث کی ویسی کوئی دوسرا نہ کرسکا، حد یہ ہے کہ بقول خلیق انجم:

''ملا صاحب کی مادری زبان اردو ہے، وہ اسی معاملے میں کسی سمجھوتے کیلئے تیار نہیں آج سے دس پندرہ سال قبل ملا صاحب نے انجمن ترقی اردو ہند کی کل ہند اردو کانفرنس میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے کہا

(۱) پیش لفظ میری حدیث عمر گریزاں پنڈت آنند نرائن ملا، انڈین پریس پرائیوٹ لمیٹڈ الہ آباد ۱۹۶۳ء۔

تھا کہ ''اردو میری مادری زبان ہے میں مذہب بدل سکتا ہوں مادری زبان نہیں، اردو کے نام سے ملا صاحب کا یہ قطعہ ملاحظہ کیجئے:

اک موت کا جشن بھی منالیں تو چلیں
پھر پونچھ کے اشک مسکرالیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگاکے مٹی اردو
اک آخری گیت اور گالیں تو چلیں

ملا ایسے فنکاروں میں شمار کئے جاتے ہیں، جنہوں نے زندگی کے صالح اقدار کی پاسداری کی، ان میں ایک زبردست قسم کی رجائیت کی خوشبو ہے۔ مایوس ہونا یا مشکلات کے روبرو سپر انداز ہونا ان کی فطرت میں شامل نہیں تھا، بلکہ وہ ہر مایوس کو خواہ وہ کوئی عام فرد سماج ہو یا قلمکار بیمار ذہن سے تعبیر کرتے ہیں ان کو یقین تھا کہ بیمار ذہن سے صحت مند ادب نہیں پیدا و سکتا ہے، ''برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس میں ہوتا ہے''

یہ نیک بھی ہے بد بھی شیطان بھی فرشتہ بھی
انسان کو کیا کہئے ہر سطح پر انساں ہے
بیماریٔ انسان کم نہ ہوئی جتنے بھی طبیب آئے اب تک
یا جسم انساں بھول گئے یا روح انساں بھول گئے
جہاں کے غل میں دبنے دے نہ آواز ضمیر اپنی
جہاں تک ہو سکے کانوں میں یہ آواز رہنے دے

ملا کے فن کی یہی انفرادیت جس کا انہوں نے صاف صاف اظہار کیا ہے مواد Subject matter پر زور دینے کے باوجود انہوں نے نزاکت فن کا خاطر خواہ لحاظ رکھا ہے، ان کا مسلک شعر یہ ہے:

ملا یہ اپنا مسلک فن ہے کہ رنگ فکر
کچھ دیں فضائے دہر کو کچھ لیں فضا سے ہم

اس کے علاوہ ان کا نظریہ یوں بھی ظاہر ہوا ہے:

وہ شعر شعر نہیں اور کچھ بھی ہے ملا
دلوں میں تیر کی صورت جو اردو کر نہ سکے

اور یہ تب ہی ممکن ہے، جب شاعر کا دل خلوص اور صداقت سے معمور ہو اور وہ اپنے احساسات کے بغیر کسی تصنع وریا کے اپنے عمیق مشاہدات کی بنا پر اسے پیکر شعر عطا کرے اور قاری یہ محسوس کرنے کیلئے مجبور ہو کہ اس کا بھی اسی طرح کا خیال تھا لیکن وہ احساسات کو (آواز) شعریت نہ دے گا۔ ان کے نزدیک شعر کو راز زندگی کا نقاب کشا ہو جانا ضروری ہے، محض ظواہر حیات کی ترجمانی کرنا نہیں۔ ملا کے نزدیک اچھی شاعری وہی ہے، جو داخلیت اور خارجیت ایک میں سمو کر کی جائے اور جس کو یہ ہنر آتا ہے وہی فنکار اچھا ادب تخلیق بھی کر سکتا ہے، اسی لئے وہ شاعر کو دانائے راز پہلے اور فنکار بعد میں تسلیم کرتے ہیں اس طرح ان کے لفظوں میں سچے فنکار کے قلم کی سیاہی خون شہیداں کی سرخی لئے چمک اٹھتی ہے۔

خون شہید سے ہے عظمت میں کچھ سوا
فنکار کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند

ملا صاحب کے نزدیک خالی ستاروں پر نظر رکھنا ہی شاعری نہیں بلکہ اس کے باوجود شاعر کے پیر زمین پر مضبوطی سے جمے بھی ہوں، انور جلالپوری نے اسی تصور کو لیکر کچھ اس طرح پیغام دیا ہے:

تم آسمان کی بلندی سے جلد لوٹ آنا
ہمیں زمیں کے مسائل پہ بات کرنی ہے

اور ملا کہتے ہیں:

شعر ملا ہے اندھیروں میں اجالے کی تلاش
فکر ملا ہے ستارے توڑ کر لانے کا نام

ملا ادب کی پائیدار اور مستحکم بنیادوں سے واقف ہیں۔ اس لئے وہ اظہار حسن اور اظہار ذات

سے زیادہ اظہار مقصد کو اولیت اور اہمیت دیتے ہیں ان کے نزدیک ادب برائے ادب کا رویہ ازکار رفتہ شے ہے اور ایسے فن کے پیچھے سطحی جذبات اور لذت کوشی کی تسکین کو ادب اور شاعری دونوں کے حق میں زہر ہلاہل سے کم نہیں:

سینے کی حرارت سے خالی گرمی چراغ شام نہ لے
یہ دل ہے امانت دنیا کی اپنا ہی بس اس سے کام لے
مے سب کو نہ ہو تقسیم اگر اپنا بھی الٹ دے پیمانہ
یہ کفر ہے کیش رندی میں ساقی سے اکیلے جام نہ لے
یہ خزاں بدوش سموم تو ہے گلوں کے ظرف کا امتحاں
وہی گل ہے گل جو فسردہ ہو تو فسردگی بھی بہار دے

ملا کے نزدیک شاعری بے چین روح کی چیخ یا دبی کچلی روح کی تڑپتی فریاد کا نام نہیں ہے بلکہ اس کو تطہیر ذہن و قلب کا وسیلہ اور تربیت وسیلہ بھی گردانتے ہیں۔ان ارفع و اعلیٰ خیالات کا عکس دیکھئے ملا کے شعر میں اس شعر کی سچائی اور ترجمانی دیکھئے:

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

ملا نے بزبان شمع نہایت سادگی سے کہہ دیا ہے:

یہ کہہ کے آخر شب شمع ہوگئی رخصت
کسی کی زندگی لینے سے زندگی نہ ملی

اس مے کو نہ پی قطرہ قطرہ گن گن کے نہ لے سانسیں اپنی
جینا ہے تو جی جینے کی طرح جینے کا فقط الزام نہ لے

بہ الفاظ دیگر شاعر نے کہا ہے کہ:

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

چند اور اشعار ملاحظہ کیجئے، جن میں احساسات و جذبات کو شعور کی آگ میں تپا کر پیش کیا گیا ہے، دنیا کیا ہے مال دنیا کیا ہے حیات کیا ہے ایک ایسی بے ثبات شے، جس کا مدار سانس کی آمد و شد پر منحصر ہے، ملا کا اسلوب اور سلیقہ اظہار لائق دید ہے:

دیر تک رہتی نہیں ایک جام میں صہبائے زیست
اس میں وہ تندی ہے کہ پیمانے پگھلتے ہی رہے
کسی کی زندگی کا رنج ہی نہ بن جائے
غم اچھا ہے مگر جب تک مزاج دل نہ بن جائے
پردہ ہے خاک کے ذرے کو جو کردے زرنگار
اونچی اونچی چوٹیوں پر نور برسانے سے کیا
سختی زیست عشق سے دور نہ ہوسکی مگر
پھول تو کچھ کھلا ہی دے دامن کوہسار میں

ملا کا نظریہ ہے کہ شاعری کا مستحکم پہلو حق گوئی اور صداقت ہے، خالی لفاظی یا اشعار کا در و بست اونچی اڑان تخیل ہی کا نہیں بلکہ ان میں ان باتوں کا ذکر بھی ضروری ہے، جو حیات سے قریب تر ہوں اور اس کا خود احساس بن چکا ہو، ان کا خود کہنا ہے:

''اگر ادب میں خلوص نہیں تو وہ انتہائی تخلیق حسن کے باوجود بھی تاریخ ادب میں کوئی بلند مقام نہیں بنا سکتا، چاہے فنی طور پر اس کا جمالیاتی کیف دلوں کو مسحور کر لے۔''(۱)

ملا کشمیری برہمن ہیں، لیکن تفریق رنگ و نسل، مذہب و اعتقاد ان کا مسلک نہیں بلکہ پیغام محبت ہے

---

(۱) میری حدیث عمر گریزاں از پنڈت آنند نرائن ملا انڈین پریس الہ آباد ۱۹۶۳ء۔

جہاں تک پہونچے۔

اسی لئے مذہب کا بھی کوئی دقیانوسی قسم کا اثر ان کی حیات قول وعمل میں مرتب نہیں ہوا ان کی مذہب بیزاری تصور خالق کائنات سے نہیں بلکہ ایسے کٹھ ملاؤں یا ڈھونگی پنڈتوں سے نفرت ہے، جو مذہب کے نام پر آپسی عناد کو بڑھاوا دیتے ہیں اور بھائی چارگی کی وہ فضا جسے سری کرشن جی نے بسندھرا کٹمبکم کہہ کر عام کیا تھا اس کنبہ انسانی کو اور اخوت ومحبت کے پیراہن کو تار تار کردینے کے درپے ہوتے ہیں۔ ملا کا دل انسانی ہمدردی سے لبریز ہے وہ کسی انسان کو انسان کے خود ساختہ گروہوں، قبیلوں اور جغرافیائی یا مذہبی خانوں میں نہیں بانٹے بلکہ انسان ہونے کے ناتے سب کو ایک سمجھتے ہیں اور من اور تو کے فرق کو مٹادینے کے حق میں ہیں، اس تعصب بھرے دور میں وہ مایوس نہیں ہیں بلکہ ان کا عقیدہ If winter comes can spring be far behind شیلے کے خیال سے ہم آہنگ ہے اگر آج دور تعصب ہے تو اگر کوشش جاری رہی تو دور امن اور عہد اخوت بھی جلوہ گر ہوگا۔

وادی نور بنے گی یہ شعلوں کی زمیں
ابھی مٹی کے فرشتے سے میں مایوس نہیں
بشر کو مشعل ایماں سے آگہی نہ ملی
دھواں وہ تھا کہ نگاہوں کو روشنی نہ ملی

اور یہ مصرعہ بھی دیکھئے، جس میں ملا کی روح بولتی ہوئی نظر آتی ہے: ع۔

میں فقط انسان ہوں ہندو مسلماں کچھ نہیں

ملا ازل سے شیخ و برہمن اور دیر وحرم کے تفرقات وتنازعات سے پاک مزاج لیکر دنیا میں آئے تھے، حب بشر یا حب نوع انساں ان کے نزدیک سب سے اعلیٰ وارفع مذہب ہے۔

ہر دیر وحرم سے کترا کر ملا آیا مے خانے میں
ملا کے سے لیکن دنیا میں سلجھے ہوئے انساں کتنے ہیں

کیوں کسی انساں سے مانگو شمع راہ زندگی
کیا بشر کے واسطے حب بشر کافی نہیں

انسانیت پران کا یہ پختہ یقین بھی دیکھئے:

پتھر بھی پگھلتا ہے اپنا تو یہ ایماں ہے
ڈھونڈو گے تو پاؤ گے دشمن میں بھی انساں ہے

ان کا ماننا ہے کہ اس دنیا میں آدمی نے ہمیشہ چڑھتے سورج کی پوجا کی ہے، یہی آج ہر غرض کا منبع ومخرج ہے، اور جب غرض ختم سارے رشتے ناتے سب ختم، بقول انور شیخ:

''وہ دوست ہی کیا جو تمہیں الو نہ بنائے''

ہر شخص غرض کا بندہ ہے ملا کیلئے انسانیت کی یہ زبوں حالی غیر تسلی بخش ہے، وہ ایسے نظام کے خواہاں ہیں، جہاں انسان انسان کے حقوق کا نگہبان ہو اور سب ایک دوسرے کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہوں:

تاریخ بشر بس اتنی ہے ہر دور میں پوجے اس نے صنم
جب آئے نئے بت پیش نظر اصنام پرانے توڑ دئے

وہ ایسا نظام چاہتے ہیں، جس کی بنیادیں اخوت ومحبت پر استوار ہوں:

محبت آج بھی ہے حاصل حیات بشر
حقیقت ابدی انقلاب کیا جانے
جہاں کو بھی تاب الفت نہیں ہے
بشر میں ابھی آدمیت نہیں ہے
بجھی بجھی سی فضا ہے دلوں کی اشک جلاؤ
نظر سے جو پگھلے تو دل کی بات چلے

اسی محبت کو عالمگیر بنانے کیلئے ملا صاحب یہ بات دلوں میں بٹھانا چاہتے ہیں ملاحظہ کیجئے:

ہر قوم سے لیکر رنگ اس کو اک قوس عالمگیر بنا

اسی رنگیں قوس کو محراب دانش گہ مستقبل کردے

''یہ درد سب کا ایک ہی ہے، یعنی محرومی، بے انصافی، حق تلفی اور ظلم خواہ کہیں بھی ہیں، اس سے پوری انسانیت مجروح ہوتی ہے۔ ذیل کے اشعار میں ہمارے عہد کی عالمی صورت حال کے بارے میں جو ایثار ملتے ہیں وہ گہرے سوچ کے حامل ہیں۔''(۱)

ملا کے یہ اشعار دیکھئے، جن میں عہد حاضر کی جیتی جاگتی تصویر دیکھی جا سکتی ہے:

وہ نبض کی رفتار کہ چھٹتے نہیں پسینے

لگتے نہیں دنیا ترے جینے کے قرینے

روشنی کا نام لیکر لڑ رہے ہیں آپس میں

اس طرف بھی کچھ سایے اس طرف بھی کچھ سایے

ستم اکثر بعنوان کرم ایجاد ہوتا ہے

چمن میں باغباں کے بھیس میں صیاد ہوتا ہے

قرنوں صدیوں میں انسان نے جینے کے سلیقے کچھ سیکھے

جینے کے سلیقے جب آئے جینے کے ارادے چھوڑ دئے

پنڈت آنند نرائن ملا کا مسلک آپسی میل جول، اخوت، بھائی چارہ اور انسان دوستی ہے وہ اپنی شاعری کے حوالے سے اکثر اس کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس جذبے کو عالمی سطح پر عام کرنے کے لئے کوشاں محسوس ہوتے ہیں عوام اس جذبہ کا فقدان ان کو مایوس نہیں کرتا اس لئے وہ اس کیلئے کوشاں بھی رہتے ہیں، اور ہر سعی مستحسن کے ساتھ فیصلہ افراد سماج پر چھوڑ دیتے ہیں۔

اب آگے تیری قسمت ہے اے قافلہ گمراہ بشر

میں نے تو اندھیری راہوں میں کچھ دیپ جلا کر چھوڑ دئے

---

(۱) مقدمہ کرب آگہی از گوپی چند نارنگ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی جنوری ۱۹۷۷ء۔

اتنا کہہ کران کواطمینان بھی ہے کہ ان کی کدوکاوش ایک نہ ایک دن ضرور رنگ لائیں گی۔

بڑھے کا سلسلہ جب ارتباط ملک وملت کا
تو اس زنجیر کو اک روز عالمگیر دیکھیں گے

ملا نے اپنی شاعری میں سیاسی یا سماجی مسائل کا کوئی حل نہیں پیش کیا ہے اور نہ یہ منصب شاعر ہے شاعر کا کام صرف سماج کو آئینہ دکھانا اور آئندہ کے درپیش امکانی خطرناک حالات سے آگاہ کرنا ہے اور وہ کام ملا نے اپنے قلم سے بخوبی کردیا ہے۔ چنانچہ وہ ایسے ناگفتہ بہ حالات عالم میں اس امکان پر بھی غور کرتے ہیں کہ یہ شاخسانہ تیسری عظیم جنگ کا روپ نہ دھار لے، اس طرف ان کا واضح اشارہ ملاحظہ کیجئے:

بشر کو سانس لینا بھی کہیں مشکل نہ ہوجائے
کچھ اتنی آج زہریلی فضائیں ہوتی جاتی ہیں

شاعری محض تفنن طبع کا وسیلہ نہیں ہے اور اس کا مقصد نام ونمود ہے، اس لئے وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ انسان کے نت نئے بدلتے ہوئے رجحانات اور افراد سماج کی خوشی وغم کے وجوہات پر بھی شاعری میں روشنی ڈالی جائے غرضکہ حیات انسانی کے صالح اقدار کی بازآفرینی ان کی شاعری کی نمایاں آواز ہے۔ ملا دوسرے افراد سماج کی طرح خارجی حالات سے بھی ضرور دوچار رہوئے لیکن انہوں نے ناصحانہ رویہ نہ اختیار کرکے برادرانہ طور پر اپنا پیغام پہونچانے کی سعی بلیغ کی ہے ان کا انداز تکلم نہایت نرم سبک اور شائستہ ہوتا ہے۔ ملا نے غزل کی فنی نزاکتوں، اس کی نوعیت جمالیت ادبیت اور افادیت پر بہت کچھ غوروفکر کی اپنے نظریات کا دامن تھام کر تجربے بھی کئے انہیں تجربات کا عکس صدائے بازگشت بن کر ان کی شاعری میں ابھرتا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے اگر غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا تو ملا اسے اردو ادب کی ریڑھ کی ہڈی Back Bone کہتے ہیں اور اسے اردو زبان کے ہاتھ کی لکیر سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر شاعری سے نظم ختم کردی جائے تو ادب کو ضرور ایسا نقصان ہوگا، جس کی بھرپائی ناممکن کی حد تک مشکل ہے، لیکن اگر غزل کو اردو ادب سے عظمت اللہ خاں صاحب جیسے ناقد کی رائے اسے لائق گردن زدنی صنف سخن مانتے

ہوئے اسے اردو شاعری سے خارج کردیا جائے تو ملا کو یقین ہے کہ اردو کا وجود ہی ختم ہوجائے گا۔ ملا کے نزدیک غزل ایک مشرب ہے ایک تہذیب ہے ایک صلح جو پیمانہ لبریز ہے، یہ محض مٹ جانے والی روایت نہیں'' (میری حدیث عمر گریزاں)

اگر بہ نظر غائر غور کریں تو بلاشبہ یہی نتیجہ برآمد ہوگا کہ اردو ادب سے غزل کو بالکل نکال دیا جائے تو ادب قالب بے روح بن کر رہ جائے گا صرف گوشہ قبر کا منتظر، اس لئے کہ اس میں مشرقی تہذیب و معاشرت مزاج اندر، ذہانت، ذکاوت، فطانت اور اسلوب و آہنگ سبھی کچھ ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ جو غزل مقتضائے حال اور حیات انسانی کی ترجمان ہو وہ بخوبی نظم کے برابر اس کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی کی جاسکتی ہے انہیں یقین ہے کہ وہ کسی ادبی منزل پر نظم سے کم نہ ہوگی۔ غزل سے مخاطب ہوئے ملا نے ایک موقع پر کہا ہے:

دلہن تھی تجھے میں نے ساتھی بنایا
شبستاں سے میدان میں کھینچ لایا
ترے نرم لہجے کو للکا دے دی
ترے دست نازک میں تلوار دے دی
دیا درد انساں کا احساس تجھ کو
کھڑا کردیا نظم کے پاس تجھ کو

ان اشعار کے دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ نظم کو غزل سے بہتر ضرور تصور کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں اخذ کیا جاسکتا کہ ملا کے یہاں اچھی غزلوں کا قحط ہے۔ صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اسی میں ڈوب کر نہیں رہ گئے، یہی ان کی اچھی سوجھ بوجھ یا دانشمندی کہی جاسکتی ہے ان کا یہ شعر دیکھئے:

زمانہ کروٹوں پر کروٹیں لیتا ہے اے ملا
مگر اب تک وہ خواب آور غزل خوانی نہیں جاتی

ملا غزل کے عاشق صادق ہیں اس کی چاہت اس سے لگاؤ ان کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے، ملا انسان سے اس کی تمام تر اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ عزیز ہے ان کی غزلوں میں عشق ومحبت کی باتیں اور ہجر ووصال کے اذکار بھی، لیکن اس طرح وہ دامن سمیٹے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ان کے اشعار میں جذباتیت، ہوس پرستی یا لذت کوشی کے اذکار نہیں ہیں بلکہ اپنے ذہن رسا اور فکر مستحسن سے وہ ایسی باتوں کی بنیاد حقیقت اور واقعیت پر استوار کرتے ہیں:

ساتھ تیرے زندگی کا وہ تصور میں سفر
جیسے پھولوں پہ قدم رکھتا چلا جاتا ہوں
میری زیر لب حقیقت کی اسے خبر نہ ہوئی
وہ تو یہ کہو کہ دنیا نے بنادیا فسانہ
مایوسیوں کی بزم میں یوں آئی اس کی یاد
سوکھے بنوں میں آگ لگاتی چلی گئی
وسعت بزم جہاں میں ہم نہ مانیں گے کبھی
ایک ہی ساقی رہے اور ایک پیمانہ رہے
بس ایک پھول نمایاں ہے دل کے داغوں میں
یہیں رکی تھی تری چشم التفات کہیں

بقول پروفیسر آل احمد سرور:

''ملا کا عشق ذرا سنبھلا ہوا اور مہذب عشق ہے مگر اس کی صداقت اور دلگدازی میں کلام نہیں۔ ملا کو جدید عاشق کی بے باکی نہیں آتی وہ نگاہوں کی زبان کو سمجھتے ہیں اور اس کے ترجمان بھی۔'' (۱)

ملا عشقیہ خیالات کے غیر صحتمند رجحانات سے دامن بچاتے گزرتے ہیں، ان کے نزدیک عشق منزل

(۱) مقدمہ جوئے شیر از آل احمد سرور ص ۲۲ نامی پریس لکھنؤ دسمبر ۱۹۴۹۔

نہیں بلکہ ایک لمحاتی ٹھہراؤ تلخی حیات سے ذرا سی دم مارنے کی مہلت:

بس اتنی فرصت الفت ہے عہد میں جیسے
کسی ساحل پہ دم لینے کو موج بیقرار آئے

ملا انسان کی جبلت اور اس کی نفسیات کا ادراک رکھتے ہیں اور اس کی روشنی میں اپنے فرس مشاعرہ کو ازن خرام دیتے ہیں، جن کے اثرات یقیناً دیر میں مرتب ہوتے ہیں لیکن دیرپا اور دوررس ہوتے ہیں:

اک ہنسی تو وہ جو ہے اشکوں سے وقتی سا فرار
اک ہنسی ہے انتہائے غم میں آجانے کا نام

وہ اگر خوش بھی ہے عرفان خوشی اس کو نہیں
جس نے جانا نہ کسی غم سے پریشاں ہونا

نہیں پیار کے قابل تو مجھ کو پیار نہ کر
مگر نگاہ ترحم سے شرمسار نہ کر

تیوری چڑھاکے پہلے تو کہنے دیا نہ کچھ
پھر مسکرا کے دل سے شکایت بھی چھین لی

ساتھ ہو کوئی تو کچھ تسکین سی پاتا ہوں میں
تیرے آگے جاکے تنہا اور گھبراتا ہوں میں

ملا کے پیش کردہ اشعار میں متانت سنجیدگی کا ابھار و بیان کا وقار تو ہے لیکن بیان میں سپردگی کا فقدان ہے ان کے نزدیک معیار عشق یہ ہے:

رمز الفت مثل میرے کوئی سمجھا ہی نہیں
آج تک میں نے اسے جی بھر کے دیکھا ہی نہیں

تم جس کو سمجھتے ہو کہ ہے حسن تمہارا
مجھ کو تو وہ اپنی ہی محبت نظر آئی

ناز و انداز نے شوخی نے نہ رعنائی نے

حسن کو حسن کیا چشم تماشائی نہیں

یہ بات درست ہے کہ: ع-''حسن بیکار ہے جب چاہنے والا نہ ہوا'' ملا کا عشق خواب وخیال کی دنیا نہیں ایک باشعور اور باخرد انسان کا عشق ہے۔ ان اشعار میں تغزل اور شعریت کی فراوانی دیکھئے:

شام غم کیا کیا تصور کی ہیں چیرہ دستیاں

ہاں تمہیں بھی تم سے بن پوچھے اٹھا لاتا ہوں میں

تڑپ شیشے کے ٹکڑے بھی اڑا لیتے ہیں ہیرے کی

محبت کی نظر جلدی سے پہچانی نہیں جاتی

سختی زیست عشق سے دور نہ ہوسکی مگر

پھول تو کچھ کھلا دیئے دامن کوہسار میں

آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار

گذرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی

شب غم بھی اے تصور دوست

زندگی کا مزہ دیا تو نے

آنند نرائن ملا نے مسائل حیات سے نبرد آزما ایک انسان کی آنکھ سے غم دوراں پر نہایت سنجیدگی سے غور کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

غم حیات شریک غم محبت ہے

ملا دیئے ہیں کچھ آنسو میری شراب کے ساتھ

ملا کے غم محبت میں شراب کی سی کیفیت ہے اس شراب میں غم حیات نے تلخی گھول دی ہے ان کے نزدیک اس کا مداوا یہ ہے کہ انسان دوسروں کی سرگردانی اور پریشانی دیکھ کر اپنا دکھ بھول جائے:

اپنا درد دل سمجھنے کی ہے یاں فرصت کسے

ہم تو اوروں کا تڑپنا دیکھ کر تڑپا کئے

اور آگے چل کر وہ اسی غم کائنات کو اپنا اجتماعی مسئلہ بنا لیتے ہیں:

اپنا ہی غم فقط ہو تو ممکن ہے جھیل لیں

ہم اک جہاں کے درد پہ تڑپائے جاتے ہیں

اسی انداز سے دوسروں کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ بنا لینا، یا دوسروں کے غم کو اپنا غم سمجھنا اور اس کی تدارک کی راہ کی تلاش کرنا انسان دوستی کا نقطہ عروج ہے:

غیر کے درد پہ بھی اشک بداماں ہونا

یہی معراج بشر ہے یہی انساں ہونا

ملا غم جاناں اور غم دوراں سے گھبراتے نہیں بلکہ غم جاناں کو غم ہستی کا مداوا سمجھتے ہیں۔ وہ غم حیات سے گھبرا کر راہ فرار بھی نہیں اختیار کرتے بلکہ ان ہمت مرداں اور حوصلہ بلند سے ہر منزل ابتلا کو بقول شخصے: ع - چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے'' کے عزم سے ہر مشکل سر کر لینے کا ہنر جانتے ہیں:

زہر غم ہنس ہنس کے پینا آ گیا

ہاں مگر دانتوں پسینا آ گیا

ملا نے اپنے اشعار میں پیام زندگی اور دعوت فکر و عمل بڑے ہی موثر انداز میں دی ہے۔ وہ اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں زندگی کو ایک مخلص انسان کی حیثیت سے دیکھتے ہیں:

حیات اک ساز بے صدا تھی سرود عمر رواں سے پہلے

بشر کی تقدیر سو رہی تھی خطائے باغ جناں سے پہلے

زندگی امید سے خالی کبھی ہوتی نہیں

روشنی بجھ کر بھی دل کی تیرگی ہوتی نہیں

اس طرح بھی ہمت دلاتے ہیں:

سانس سمائے جب تلک نغمۂ زیست گائے جا

ہونٹوں کو سی بھی دیں اگر دل ہی میں گنگنائے جا

ملا نظریہ ارتقا پر ایمان رکھتے ہیں اور اس ایمان کی بنا پر انسان کو آگے بڑھتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں، جس طرح ٹھہرے ہوئے پانی میں کائی لگ جاتی ہے اسی طرح کارگاہ حیات میں قیام یا ٹھہراؤ کو انسان کی موت سے تعبیر کرتے ہیں:

ارتقا کی راہ میں رکھنا ہی ہے انساں کی موت

ہیں وہی زندہ جو اس رستے پر چلتے ہی رہے

خستگی و تشنگی و رہزن و ریگ سراب

کتنی صدیاں ہوگئیں انسان چلتا جائے ہے

تیرگی اور نور کی مسلسل کشمکش ہی کا دوسرا نام ارتقا ہے:

تیرگی بڑھ بڑھ کے تاروں کو بجھاتی ہی رہی

تیرگی کو چیر کر تارے نکلتے ہی رہے

ملا کے خیال سے انسان کو کسی پہلو قرار نہیں وہ نہ انقلاب چاہتا ہے نہ جمود۔ کیونکہ پرامن زندگی کیلئے یہ دونوں باتیں مضر ہیں جس طرح ایک پودا ہوا اور دھوپ کے بغیر زندہ نہیں رہتا اس طرح انسان بھی ایک نا قابل تبدیل نظام میں زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتا۔

نظام میکدہ ساقی بدلنے کی ضرورت ہے

ہزاروں ہیں صفیں جن میں نہ مے آئی نہ جام آیا

ثبات پا نہ سکے گا کوئی نظام چمن

فسردہ غنچوں کو جس میں شگفتگی نہ ملی

یہ تاریخی سچائی ہے کہ:

جب بھی گھری ہے موجوں میں کشتی حیات کی
ابھرے ہیں موج ہی سے کنارے نئے نئے

ملا کے اشعار میں کہیں کہیں سیاسی اشارے بھی نظر آتے ہیں ایسی اشاریت جو کبھی پہلے محتاج تعبیر وتشریح ہوا کرتی تھی۔ آزادی کے بعد بالکل واضح ہوگئی ہے ملا کے یہاں یہ اشاریت اور وضاحت دونوں موجود ہیں:

وہ گل قفس میں رکھ کے نہ صیاد دے فریب
دیکھا ہی جیسے ہم نے کبھی آشیاں نہیں
مرغ آزاد اسیروں کو حقارت سے نہ دیکھ
ان کی طاقت بھی مرے بازوئے پرواز میں ہے
آزادی کسی کو حاصل ہے ہر نظم جہاں اک زنداں ہے
بس فرق ہے اتنا کس زنداں میں روزن زنداں ہے

سبھی الفاظ سمجھے بوجھے اور مانوس ہیں پھر بھی ان میں ایک نیا پن ایک نئی معنویت ظاہر ہوتی ہے۔ ملا کے اشعار میں گل، گلستاں، گلشن، برق و شبنم، بادوباراں، ہنگام بہاراں، چمن، چمن پرست، دور گل، فصل گل، جام وسبو دار و رسن کے علامتی پیرائے میں سماجی معنویت قومیت اور درد انسانیت کی جو تصویریں ابھرتی ہیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

الگ الگ سے افق پر ہیں چھوٹے چھوٹے غبار
یہ کارواں کو مرے کیا ہوا خدا جانے
انتظار فصل گل میں کھو چکے آنکھوں کا نور
اور بہار باغ لیتی ہی نہیں آنے کا نام

چمن کو برق وباراں سے حظ اتنا نہیں ملا
قیامت ہے وہ شعلہ جو نشیمن زار ہوتا ہے
ہے یہی اس چمن کی خوبی کہ ہر نیا بادل یہاں
بن کے نیساں آئے ہےاور آگ برسا جائے ہے
جفا صیاد کی اہل وفا نے رائیگاں کردی
قفس کی زندگی وقف خیال آشیاں کردی

آنندنرائن کا تخلص ملا کوئی مکتبی ملا نہیں ہے بلکہ انہوں نے اپنے خاندانی نام ملا کو ہی اپنا تخلص ٹھہرایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنندنرائن ملا اور مولوی والے ملا میں ایسا بعد ہے، کہ جسے ہم بعد بین المشرقین کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ملا صاحب نے مومن کی طرح اپنے تخلص کی رمزیت سے خوب ہی خوب فائدے اٹھائے ہیں:

شیخ جی ملا یہ لعنت بھیجئے کافر ہے وہ
آیئے ہم آپ کچھ اسلام کی باتیں کریں
اب تو بھولے حدیث دل ملا
یاد پروردگار کون کرے
شاعری آج نعرے ہی نعرے
اور ملا تو بس اذاں ہی اذاں

ملا کے اشعار میں سادگی اور سہل التفہیم کے وصف کے باوجود مختلف صنعتوں کا استعمال بھی کھل کر نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار کو استعارہ رعایت لفظی سہل ممتنع، تلمیحات، استفہامیہ انداز اصطلاحات روزمرہ استدلال ایجاز نکتہ آفرینی جدت وندرت بلاغت ومعنویت اور ہندی وسنسکرت کے الفاظ کے استعمال سے جس قدر استوار کیا ہے وہ لائق آفریں ہے:

اور اب اس سے سوا چاہتے ہو کیا ملا
یہ کم ہے اس نے تمہیں مسکرا کے دیکھ لیا

تمہیں خیال کی رعنائیوں میں دیکھا ہے
تمہیں امید کی تنہائیوں میں دیکھا ہے
رمز الفت مثل میرے کوئی سمجھا ہی نہیں
آج تک میں نے اسے جی بھر کے دیکھا ہی نہیں
عشق پر موقوف کچھ دل کی تمنا ہی نہیں
قصہ یوسف میں اک باب زلیخا ہی نہیں
ننگ رسوائی ہو جس کو جذبہ مجنوں نہیں
چھپ سکے جو پردہ بینا میں صہبا ہی نہیں
کب تک کسی سے مانگ کے ہم لیں اختیار
اب جی میں ہے کہ شیر سے لڑکر کچھار لیں

آخری شعر میں ملانے ہر ظلم وستم اور جبروتی طاقتوں کے لئے شیر کا استعارہ استعمال کیا ہے جو بہت زیادہ بلیغ ہے دو تین اشعار اور دیکھئے:

بزم ادب ہند کے ہر گل میں ہے خوشبو
ملا گل اردو کی مہک اور ہی کچھ ہے
کس نے دیکھا ہے جمال روئے دوست
سب نقابوں میں الجھ کر رہ گئے
پوچھتے ہیں لوگ بزم شعر میں یہ کون ہیں
کیا کوئی اہل سخن اپنا شناسا ہی نہیں

اردو شاعری میں شیخ وزاہد سے چھیڑ چھاڑ کا رویہ قدیم ہے اور اکثر شعراء نے طنزیہ مزاحیہ پیرائے میں بڑے کام کی بات بھی کہہ دی ہے صرف غور وفکر کی نگاہ کی ضرورت ہے جیسے غالب کا یہ شعر:

آج کانوں میں مرے آئی تھی آواز اذاں

جی رہے ہیں کچھ اگلے زمانے والے

اور فرقت کاکوروی کہتے ہیں:

شیخ آئے جو محشر میں تو اعمال ندارد

جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد

ملا نے اپنے طنز کی ایک نئی راہ اور نیا انداز اس شعر میں پیش کیا ہے:

شیخ اس حور کے لئے سجدے

جو ابھی جنس معتبر بھی نہیں

رعایت لفظی کلام میں زور پیدا کرتی ہے اس میں اکثر فصاحت کی ایک جھڑی سی لگ جاتی ہے، ذیل کے شعر میں برق و باد صیاد گھات سے نہایت ہی عمدہ لفظی تعلق دیکھئے:

برق بھی بار بھی اور گھات میں صیاد بھی

پھر بھی یہ سچ ہے چمن پر رنگ آتا جائے ہے

مختلف صنعتوں کے استعمال کے اس اظہار کے ساتھ ملا کے کلام کے اس سوز و گداز نشتریت کو بھی ملاحظہ کیجئے:

نہ عقل کوہ پر ہے نہ دیں کی وادیٔ راز میں ہے

بشر کی سب سے جمیل تصویر دل کے سوز و گداز میں ہے

شعریت کا حسن ملاحظہ کیجئے:

راز ہنسی تشنہ تعبیر ہے تیرے بغیر

زندگی تقصیر ہی تقصیر ہے تیرے بغیر

دل کا چراغ جب تلک تجھ سے جلے جلائے جا

رات بھی ہے اگر تو کیا رات کو دن بنائے جا

دکھ جاتا ہے جب دل تو ابل پڑتے ہیں آنسو
ملا کو دکھانے کا تڑپنا نہیں آتا

اسی زمرے کے دو اشعار اور ملاحظہ کیجئے:

محبت میں کوئی شے کامیابی ہے نہ ناکامی
نظر ملتے ہی اس سے زیست قیمت پا گئی اپنی
ہوا میں جیسے اک خوشبو سی ہے مرجھائے پھولوں کی
مگر ملا کو یاد آتی ہے شام زندگی اپنی

ملا کو اپنی شام زندگی کتنی عزیز ہے اس میں وہ کتنی لذت اور لطافت دیکھتے ہیں ان سب کا نچوڑ انہوں نے اس شعر میں پیش کر دیا ہے اس طرح سادگی پرکاری تازگی اور توانائی سے مملو ایک غزل کے چند اشعار دیکھئے، ان میں تغزل کی ایک مخصوص فضا بھرپور چاشنی لئے ہوئے ہے:

بشر کو مشعل ایماں سے آگہی نہ ملی
دھواں وہ تھا کہ نگاہوں کو روشنی نہ ملی
لبوں پہ پھیل گئی آکے موج غم اکثر
بچھڑ کے تجھ سے ہنسی کی طرح ہنسی نہ ملی
ثبات پا نہ سکے گا کوئی نظام چمن
فسردہ غنچوں کو جس میں شگفتگی نہ ملی
وہ قافلے کہ فلک جن کے پاؤں کا تھا غبار
رہ حیات میں بھٹکے تو گرد ہی نہ ملی
وہ تیرہ بخت حقیقت میں ہے جسے ملا
کسی نگاہ کے سایے میں چاندنی نہ ملی

ملا کے چند اور اشعار ملاحظہ کیجئے، جو یقین ہے اہل ذوق کی ذہنوں میں محفوظ ہوں گے، سہل ممتنع کا حسن اور اشعار کی پرکاری ملاحظہ کیجئے:

اک ہنسی تو وہ جو ہے اشکوں سے وقتی سا فرار
اک ہنسی ہے انتہائے غم پہ آ جانے کا نام

یہ کہہ کے آخر شب شمع ہوگئی خاموش
کسی کی زندگی لینے سے زندگی نہ ملی

نگاہ دوست کو اس کی بھی ہے خبر لیکن
وہ راز جس کا ابھی دل میں راز دار نہیں

مجھے کرکے چپ کوئی کہتا ہے ہنس کر
انہیں بات کرنے کی عادت نہیں ہے

اک سلام اک مسکرہٹ اک سوال اک شکریہ
وہ بھی یونہی راہ میں آتے ہوئے جاتے ہوئے

تیوری چڑھاکے پہلے تو کہنے دیا نہ کچھ
پھر مسکراکے دل سے شکایت بھی چھین لی

ملا نے شاعری کیلئے اپنا انوکھا اور منفرد راستہ تلاش کیا ہے، جس کی توثیق خود ان کے شعر سے ہوتی ہے:

وادیٔ شعر میں یہ جادۂ ملا ہی نہ ہو
اک الگ ہٹ کے نشاں کف پا ہے تو سہی

ملا کی زبان نرم ہموار اور سلیس ہے اسلوب بیان منفرد مخصوص لب ولہجہ، دقیق خیالات، تشبیہات کا خوبصورتی کے ساتھ استعمال فارسی تراکیب، بندش میں چستی اشعار میں نئی معنویت مخصوص تجربات تخیل کی بلندی فکر کی گہرائی، جذبات کے بیان کا توازن، دلکشی متانت اور سنجیدگی ان کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ ملا

کی آواز ماضی کی صدائے بازگشت، حال کا رزمیہ، اور مستقبل کی نقیب ہے، انہوں نے مشاعروں میں اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی مسائل کے حل کا کوئی نسخہ نہیں پیش کیا ہے اس لئے کہ شاعر کا یہ کام نہیں۔ شاعر کا کام جیسا کہ پچھلے اوراق میں لکھا جا چکا ہے صرف سماج کی صحیح صورت حال کو سامنے لاکر انسانیت کو پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کرنا ہے۔ آگے ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں۔ یہ وہ چیز ہے، جو ہنگامی اور دائمی ادب کے بیچ ایک خط فاصل کھینچتی ہے۔ ملا کی شاعری کا خاص وصف یہ ہے کہ انہوں نے زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں کیسے سوچا اور کس طرح اپنی سوچ وفکر کو اپنی شاعری میں سمویا، اس اعتبار سے پنڈت آنند نرائن ملا شعر وادب کی ایک توانا اور منفرد شخصیت کے حامل نظر آتے ہیں، بقول عبادت بریلوی:

''ان کی غزلوں میں اقبال کی غزل کی معنویت اور گہرائی بھی ہے، رنگینی اور رعنائی بھی ہے۔ ملا صاحب اپنی غزلوں میں ان سب سے متاثر ہوئے ہیں بلکہ ان شعراء کے علاوہ بعض دوسرے ہم عصر غزل گو شعراء کا اثر بھی ان کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔ لیکن ان تمام تاثرات کو ان کی انفرادیت ایسے سانچے میں ڈھال لیتی ہے، جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہے۔''(۱)

ملا اردو شاعروں کے مزاج داں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کلاسیکی ادب کا نہایت وسیع پیمانے پر مطالعہ کیا ہے، وہ اپنی شاعری میں زبان وبیان کو بطور خاص ملحوظ رکھتے ہیں ان کی شاعری بلند خیالات، دلکش بیان شعریت، متانت اور خاص بات یہ کہ غزلیت سے بدرجہ اتم مملو ہوتی ہے، جہاں تک ان کے فن کا سوال ہے اس سلسلے میں خود ان کا کہنا ہے:

اظہار درد دل کا تھا اک نام شاعری
یاران بے خبر نے اسے فن بنادیا

یاران بے خبر دامن بچاتے ہوئے جنہوں نے شاعری کو فنکاری کا روپ دیا ملا نے اپنے کلام کو حقیقت نگاری مشاہدے اور تجربات کا عکاس بنا کر پیش کیا، اسی لئے ان کے یہاں دل گرفتگی، دلکشی، معنویت، اثر آفرینی اور خلوص کی جھلک نمایاں ہے۔

---

(۱) جدید شاعری ص ۳۱۵ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔

# باب چہارم

# آنند نرائن ملا کی نظم گوئی

نظم شاعری کی اس صنف کو کہتے ہیں، جس میں کسی ایک خیال یا واقعہ کو تسلسل سے بیان کیا جائے۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اس لئے کہ اس کیلئے ہیئت، بحر اور موضوع کی کوئی قید نہیں ہے۔ پروفیسر احتشام حسین صاحب نظم کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''جب نظم کا نقطہ شاعری کی ایک خاص صنف کیلئے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اشعار کا ایک مجموعہ جس میں ایک مرکزی خیال ہو اور ارتقائے خیال کی وجہ سے تسلسل کا احساس ہو۔ اس کیلئے کس مخصوص موضوع کی قید نہیں اور نہ ہی ہیئت ہی معین ہے۔'' (۱)

اردو میں باقاعدہ نظم نگاری کا آغاز انجمن پنجاب کے قیام ۱۸۷۴ء کے بعد سے ہوا تھا۔ لیکن اس سے قبل بھی اردو شاعری اس صنف سخن سے محروم نہیں تھی۔ نظیر اکبرآبادی کی تخلیقات کے ایسے نمونے موجود تھے، جن کو نظم کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہی وہ خیال ہے، جس کی بنا مجنون گورکھپوری نظیر آبادی کو پہلا نظم گو شاعر گردانتے ہیں۔

اگر قصائد اور مثنویات کو نظم میں شمار نہ کیا جائے اور نظم کی اصطلاح کو جدید معنوں میں استعمال کیا جائے تو نظیر اردو کے پہلے نظم نگار ہیں۔'' (۲)

۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کی کوششوں سے ایک نیا رجحان اور ذوق نظم نگاری کی طرف نظر آتا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ درست ہی ہے۔

---

(۱) اردو شاعری کا تاریخ اور فنی ارتقاء سید احتشام حسن رضوی، نگار سخن نمبر ۱۹۵۷ء ص ۱۲۹۔

(۲) نقوش و افکار مضمون نظیر اکبرآباد اردو شاعری میں واقعیت اور جمہوریت کا ظہور از مجنون گورکھپوری ص ۲۳۷۔

''۱۸۷۴ء سے ۱۹۲۰ء تک کی لگ بھگ پچاس سال کی درمیانی مدت میں چونکہ دوسرے اصناف سخن کے مقابلے میں نظمیں زیادہ لکھی گئیں اس لئے اس دور کو نظم نگاری کا دور کہہ سکتے ہیں۔ اس دور کے مشہور نظم گوشعراء بے نظیر شاہ، محمد اسماعیل میرٹھی، منیر شکوہ آبادی، احمد علی شوق قدوائی، برج نرائن چکبست، جوش ملیح آبادی، محمد اقبال، سیماب اکبرآبادی، وحید الدین سلیم، نظم طباطبائی، افسر میرٹھی، احسان دانش، اختر شیرانی، حفیظ جالندھر اور جگت موہن لال رواں اناوی وغیرہ ہیں۔'' (۱)

ہر شاعر کے کلام میں اس کے عہد کی خصوصیات ضرور نمایاں ہوتی ہیں چنانچہ ملا نے بھی اپنے عصری تقاضے یعنی نظم گوئی کی طرف خصوصی توجہ صرف کی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی بنیاد شاعری نظم گوئی ہے تو راقمہ کے خیال سے زیادہ مناسب ہوگی چنانچہ انہوں نے اس ذوق وفکر میں نظموں میں اپنی جدت خیال، طرز ادا، نگاہ دوررس اور زور بیان سے صفحۂ قرطاس پر ایسے گلہائے رنگ رنگ بکھیرے ہیں، جن کی مہک ایوان اردو شاعری کو نہ جانے کب تک معطر رکھے گی۔ ملا کی نظموں کی بنیاد زیادہ تر جذبات واحساسات پر ہی نہیں بلکہ ان کی نظموں میں عقل وشعور کی بھی کارفرمائیاں جلوہ گر ہیں ملا کی سبھی نظموں کی زبان صاف سادہ اور رواں دواں ہے جگہ جگہ پر چکبست کی نظموں کی سادگی اور سلاست کا احساس ہوتا ہے پھر بھی ہر جگہ ان کے گہرے مشاہدے باریک بینی، نکتہ سنجی، دقیقہ رسی، جدت ادا، بلندی تخیل، قوت بیان اور حق گوئی، بے باکی اور جرأت اظہار کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نظموں کی خاصی خوبی سہل ممتنع ہے۔ سہل ممتنع اشعار کی اس سادگی وسلاست کو کہتے ہیں، جسے دیکھ کر ہم بے اختیار کہہ اٹھیں'' گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'' اور ایسا لکھنا آسان ہے اور جب ہم لکھنا چاہیں تو نہ لکھ سکیں سہل ممتنع کی تعریف مولانا حسرت موہانی یہ لکھتے ہیں:

''سہل ممتنع سادگی اور حسن بیان کی اس صنف کا نام ہے،، جس کو دیکھ کر ہر شخص بظاہر یہ سمجھے کہ یہ بات بھی میرے دل میں تھی اور ایسا لکھنا ہر شاعر کے لئے آسان ہے جب خود کوشش کرے اور ویسا لکھنا

---

(۱) جگت موہن لال رواں حیات اور اور ادبی خدمات ص ۲۰۴ ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۴ء۔

چاہے تو نہ لکھ سکے۔'' (۱)

بیسویں صدی کا ابتدائی دور سیاسی اور سماجی بیداری کا دور تھا اکثر شعراء نے اپنے قلم کے وسیلے سے اس دور کی ابھرتی ہوئی تحریکوں سے خود کو وابستہ کر رکھا تھا۔ ملا نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی تھی چنانچہ ان کی شاعری میں بھی وہی اثرات پیدا ہوئے جو اس سے پہلے کے شاعروں میں مرتب ہوئے تھے۔ سیاسی طور سے ملا مہاتما گاندھی کے خیالات سے متفق تھے اور وہ اس عقیدت پر قائم بھی رہے۔ اس لئے ان میں جذبہ آزادی کا ابھرنا فطری بات تھی۔ قدرت نے ملا کو ایک دردمند دل عطا کیا تھا۔ اس لئے وہ معاشرے میں پھیلی ہوئی ناانصافیوں، برائیوں کو دیکھ کر'' کانٹ چبھے کسی کے تڑپتا ہے میرا دل'' کے مصداق بے چین ہو جایا کرتے تھے۔ انسان سے اسی لگاؤ کی بنیادوں پر یہ کہنا غلط نہیں کہ ان کی شاعری کا بنیادی موضوع انسان ہے۔ ملا کا زمانہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا بھی زمانہ تھا لیکن انہوں نے خود کو تحریک کے کسی ایک گوشے میں اسیر نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے ہر اس جگہ یا موقع پر جہاں انسانیت کا خون ہوتے دیکھا، خواہ وہ غلامی کے اندھیرے ہوں غریبی کی بے چینیاں ہوں عورتوں پر ڈھائے جانے والے مظالم ہوں، یا رومانی جذبات کی گھٹن ملا نے ان ساری باتوں پر بے لاگ قلم اٹھایا ہے، بقول علی جواد زیدی:

''ملا کے مشاہدات کا دامن بہت وسیع ہے ایٹمی توانائی ہپّی، اندھیر نگری، محبت کرنے والی جوان روحیں، پوجا کرنے کے حوصلے، محافظ وطن سپاہیوں کے ولولے، معمولی انسان کے سینے میں ایک چھوٹا بالک چھپا ہے۔ عقل و دل کا تضاد بوڑھا مانجھی محفل میں شمع محفل کی تنہائی بے کس کا چراغاں، کاروان زندگی کا سفر، گاندھی، نہرو، سروجنی نائیڈو سے لے کر بیڑی پینے والا مفلس تک، سیاست کی مسند سجانے والوں سے لیکر استحصال کا شکار تک کوئی بھی ان کی تیز نگاہوں کی رسائی سے دور نہیں۔ علی العموم اتنے کینوس کو اتنے ہی وسیع علم کے بغیر سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔'' (۲)

فرقت کاکوروی لکھتے ہیں کہ'' ملا کبھی کبھی اپنے دل کا بخار نظم معریٰ کہہ کر بھی نکال لیا کرتے ہیں طبیعت

---

(۱) اردوئے معلی بابت اپریل ۱۹۴۰ء۔

(۲) سیاہی کی ایک بوند علی جواد زیدی نامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۳ء۔

کا زور الفاظ کی دل جوئی اسلوب کی دلکشی اور محبت کی حلاوت اس میں اپنے پورے شباب پر نظر آتی ہے۔''

مسدس پر ملا کو کافی دسترس حاصل ہے اسی شکل کی نظمیں ان کی نسبتاً زیادہ کامیاب بھی ہیں لیکن کہیں کہیں انہوں نے بندوں کی ساخت میں بھی جدت دکھائی ہے، جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے کسی بھی موضوع کو انہوں نے نعرہ بازی یا پند و نصائح کا روپ نہ دے کر اشارے کنائے میں اپنی بات کہہ دی ہے یہی وصف ان کی نظموں میں ادبیت پیدا کرتا ہے ویسے تو عموماً ملا کی سبھی نظمیں ادبیت کی شان رکھتی ہیں، جن سے ان کی فنکارانہ مہارت اور چابکدستی کا ثبوت بہم پہونچتا ہے بالخصوص ان کی رومانی نظمیں جیسے کافی ہاؤس، مریم ثانی وغیرہ خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے ملا کی نظمیں مختلف النوع ہیں چنانچہ موضوع کے اعتبار سے ان کا جائزہ پیش ہے:

## قومی اور وطنی نظمیں

انسان کے اندر فطری طور سے مختلف جذبات کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں وطن اور قوم سے لگاؤ کا جذبہ فطری اور لازوال جذبہ ہے وطنیت کا یہی تصور یا جذبہ غیر شعوری طور پر انسان کے اندر نمو پذیر ہوتا اور پروان چڑھتا ہے۔ ہر انسان کی اپنی سرزمین، وہاں کی مٹی، پیڑ پودے، جنگل پہاڑ سے اسے ویسا ہی عشق ہوتا ہے جیسا کہ خود اپنی زندگی سے۔ یہی جذبہ وطنیت اسے وطن پر قربان ہوجانے کا حوصلہ دیکر اسے لازوال بنادیتا ہے۔ انسان کو محدود فضا اور اس کی اپنی چہار دواری سے باہر لاکر آفاقی بنادیتا ہے۔ وطنیت یا قومیت کا یہ جذبہ دنیا کے ہر خطے میں کم وبیش یکساں ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں قومیت اور وطنیت کا جذبہ اس کے ابتدائی دور ہی سے نظر آتا ہے مقامی رنگ اشجار، پھول پتی، موسم مناظر تیوہاروں وغیرہ کے افکار وطنیت کے اسی تصور کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالوحید صاحب لکھتے ہیں:

''جب اس کے وطن پر کسی مصیبت یا ابتلا کا وقت آتا ہے تو اسی فطری لگاؤ کے اثر سے جذبہ حب الوطنی کو تحریک ہوتی ہے اور انسان وطن کی خدمت پر کمر بستہ ہوجاتا ہے۔ موجودہ دور میں بعض ملکوں اور

قوموں میں حب الوطنی نے تنگ نظری کی صورت اختیار کر کے اس فطری جذبہ کو بڑا گھناؤنا بنا دیا ہے لیکن فطری حب الوطنی اس تعصب سے بہت مختلف ہے اس میں انسان اپنے وطن سے محبت کرتا ہے اور جہاں اپنے وطن کی دشمنوں سے حفاظت کرتا ہے وہاں دوسری اقوام اوران کے وطن کی آزادی کا احترام بھی کرتا ہے۔''(۱)

بیسویں صدی کے آغاز میں سیاسی تحریکات اور انگریز حکومت کے جبر وظلم کے ماحول نے بھی ارد وشاعروں کو اس طرف زیادہ سے زیادہ نظمیں لکھنے پر مجبور کیا، ملا اسی رستہ خیز زمانے کے پروردہ ہیں جذبہ وطنی اور قومی شاعری کا دور شباب تھا، جس وقت ملا نے شاعر شروع کی وہ زمانہ ملک میں آزادی کی تحریک کا بھی دور شباب تھا۔ محبان وطن کا نعرہ ۱۹۳۵ء میں کہی گئی ملا کی ایک نظم ہے، جس میں وطن پر قربان ہونے کو وہ حاصل حیات سمجھتے ہیں:

چند اشعار ملاحظہ کیجئے، جن میں ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کی طرف اشارہ بھی ہے:

وزرائے ملک ہونا حاصل قسمت سمجھتے ہیں
وطن پر جان دینے کو ہی ہم جنت سمجھتے ہیں
وطن کا ذرہ ذرہ ہم کو اپنی جاں سے پیارا ہے
نہ ہم مذہب سمجھتے ہیں نہ ہم ملت سمجھتے ہیں
غلامی اور آزادی بس اتنا جانتے ہیں ہے
نہ ہم دوزخ سمجھتے ہیں نہ ہم جنت سمجھتے ہیں
دکھانا ہے کہ لڑنے میں جہاں میں باوفا کیوں کر
نکلتی ہے زبان سے زخم کھا کر مرحبا کیوں

نظم ''ہم لوگ'' سرخی انقلاب اور نعرہ انقلاب سے مملو ہے اس میں انہوں نے انقلاب کا صور فرد

---

(۱) اردو انسائیکلوپیڈیا ڈاکٹر عبدالوحید فیروز سنز لمٹیڈ لاہور ۱۹۶۲ء۔

واحد سے نکال کر پوری قوم کے کانوں میں پھونک دیا ہے، اس نظم میں عزم و ہمت کی ایک نئی جہت کی طرف اشارہ بھی ہے:

سرخی انقلاب ہیں ہم لوگ
عنفوان شباب ہیں ہم لوگ
سونے والوں کو کردیا بیدار
اک پریشاں سا خواب ہیں ہم لوگ
کون آنکھیں ملائے گا ہم سے
جلوہ بے نقاب ہیں ہم لوگ
قوم کا دل ہلا دیا ہم نے
نالہ مستجاب ہیں ہم لوگ
کون دے گا صدا پہ اپنی صدا
نعرہ انقلاب ہیں ہم لوگ

ملا کی ۱۹۳۱ء میں لکھی ہوئی ایک نظم ''زمین وطن'' ہے اس کے مطالعہ سے ملا کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ناگزیر سا ہو جاتا ہے۔ اس نظم میں ایک ارتقائی تسلسل ہے، سادگی اظہار خیالات کے ساتھ ساتھ شاعر کی واردات قلب کی زندہ شبیہ سامنے آ جاتی ہے مادر وطن کی مٹی اور اس میں انسانی تخلیق زندگی کی نشو و نما وغیرہ جیسے مراحل سے گزرے ہوئے مظاہر فطرت کوہ و دریا جاہ وجلال اسلاف میں گوتم، کرشن، رام کا ذکر دہلی چتوڑ کی عظمت حسینان چمن، عصمت طہارت اور پاکدامنی غرض کہ پورے ہندوستان کی تہذیب و تمدن ارتقا سے لے کر موجودہ دور تک کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے، یہ بند دیکھئے:

جہاں اک کنول پہ بصد دلیری
اٹھی دودھ کی کنڈ سے لچھمی

قدم شیو کے شانوں پہ دھرتی ہوئی
اتر آئی گنگا جہاں خندہ زن
زمین وطن اے زمین وطن
لئے غیر ملکوں نے تجھ سے سبق
تری داستاں کے اڑا کے ورق
ترے خوشہ چیں از شفق تا شفق
عرب مصر یوناں چین وفتن
زمین وطن اے زمین وطن

وطن کی مٹی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس مٹی میں ابن آدم نے آنکھیں کھولیں، اور نسل انسانی نے گھٹنوں کے بل چلنا سیکھا، اسی مٹی میں ایزدواہرمن تراشے گئے، انسان نے خیروشر میں تمیز کرنے کا سلیقہ جانا، وطن کی عظمت و بزرگی کا ذکر کرتے ہوئے یہاں تک کہتے ہیں کہ کس طرح تہذب انسانی، ایران، مصر، روم وعرب یہاں کی مٹی سے فیضیاب ہوئی اور علم وحکمت حساب وجغرافیہ پریم اور بھگتی سے ان کے دلوں کو حیات جاودانی ملی۔ اس کے بعد ملا وطن کے ان سورماؤں کا ذکر کرتے ہیں، جن کی ہمت وشجاعت کے روبرو سبھی کے سرخم ہوجاتے ہیں۔ ان سب کی یاد اور ملا کے دل وجذبے کی بے تابی وبے قراری ظاہر ہوتی ہے کہ ملا وطن کے لئے کس قدر بے تاب ہیں۔ ان کی حسرت دل وتڑپ ملا کی وطن سے محبت کا پتہ دیتی ہے۔ پوری نظم میں ایک خاص قسم کی غنائی لہریں ربط وتسلسل کا حسین امتزاج نظم کے حسن کو دوچند کرتا ہے، اس کے بعد نظم اختتام تک پہونچتی ہے، انقلاب اور آزادی کی خوشبو سے فضائے وطن مشکبار ہوجاتی ہے، ایسے نازک وقت میں اخوت ومساوات انسانی اور روایات ماضی کی جانب اشارہ ملا کی بلندی تخیل اور انسانیت اور انسان کیلئے ان کے دل کی تڑپ سب کی طرف دلپذیر اشارہ ہے یہی ملا کا مشن معلوم ہوتا ہے۔

اخوت کا پھر ہاتھ میں جام لے
مساوات انساں کا پھر نام لے

روایات ماضی سے پھر کام لے
وطن کو بنا در حقیقت وطن
زمین وطن اے زمین وطن

ملا کی قومی نظموں میں ایک نظم ''لال قلعہ'' ہے، جو جنوری ۱۹۴۶ء کی تصنیف ہے، صدیوں سے غلامی کا دکھ جیل رہے ہندوستانیوں کے دلوں میں اس حکومت سے نفرت اور نجات حاصل کرنے کا جذبہ بیدار ہو چکا تھا، ملا کے قلب وذہن میں بھی آزادی وطن اور سرفروشی کا جذبہ موجزن تھا، جس کی نمائندگی یہ نظم کرتی ہے اور ملا کا جذبہ حب الوطنی کا اظہار بھی۔ اس نظم میں انہوں نے ۱۹۵۷ء کے انقلاب سے لے کر ۱۹۴۶ء تک کی قومی تحریک کا جائزہ لیا ہے لال قلعہ ہندوستان کی عظمت کا عکاس اور اس کی پائیداری اور نفاست ملک کی سربلندی کی علامت ہے ملا نے اس عظمت وسربلندی قلعہ کو سمبل Symbol بنا کر یہ نظم لکھی ہے اس لئے اس میں دلپذیری بھی زیادہ ہے۔

ذرہ ذرہ خود اپنی جگہ جن کا ہیرا اور پنا تھا
ان دیواروں کی قسمت میں زنداں فرنگی ہونا تھا
معراج وطن بھی دیکھ چکے تاراج وطن بھی دیکھ لیا
اپنے دل پر پتھر رکھ کر سن ستاون بھی دیکھ لیا

آخر میں شوق آزادی میں قربان ہو جانے والے باعزم اور حوصلہ مند سور ماؤں کا ذکر بڑے ہی دلکش انداز میں کیا گیا ہے۔ اس طرح تاریخی تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے نظم آگے بڑھتی ہے اس نظم کا آخری شعر دیکھئے، جس میں ملا نے ہندوستان کے بچے بچے کے قربان ہو جانے کے جذبے سے ملا کو یقین ہے کہ ایسے حالات میں ملک ضرور آزاد ہوگا۔

پھر آزادی کا پرچم ان دیواروں پر لہرائے گا
وہ دن آئے گا جلد آئے گا یقیناً آئے گا

صبح آزادی آ ہی گیا، اور سجدہ عقیدت نظمیں ملا کے خواب آزادی کا ثمرہ ہیں۔ ابتدائی نظموں کے مقابلے میں ان میں پختگی وقار اور ٹھہراؤ ہے ساتھ ہی ملا کا موثر انداز بیان فکر وفن کی دلآویزی انہیں امتیاز عطا کرتی ہے، نظم آ ہی گیا کا آغاز یوں ہوتا ہے:

حکم معزولی بنام تیرگی آ ہی گیا
وادی شب میں پیام تیرگی آ ہی گیا
روشنی ڈوبے ہوئے تاروں کی کام آ ہی گئی
آج ہر ذرے میں نور کو کمی آ ہی گیا
چیرتا ظلمت کو تہ سحاب اندر سحاب
پھر افق پر آفتاب زندگی آ ہی گیا
آخر کے دو اشعا رملاحظہ کیجئے:
دور آہن دور ایماں دور شاہی دور زر
روندتا ان سب کو دور آدمی آ ہی گیا
اک حقیقت بن کے ملا خواب ارمان وطن
لے زہے قسمت کہ اپنے جیتے جی آ ہی گیا

نظم صبح آزادی (اگست ۱۹۴۷ء)

ملا کے شرمندہ تعبیر خوابوں کا دلفریب منظر پیش کرتی ہے۔ آزاد نظم کی ہیئت میں ہونے کے باوجود نظم کا تاثر ان کے دل کے جذبات کی مکمل ترجمانی ہے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں ملک پنجہ استبداد سے گلوخلاصی حاصل ہوئی ہر فرد خوشی میں ڈوب گیا اور کرن امید اور نئے خواب نشاط ابدی میں ڈوب گیا۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

شب مردہ کی لاش حسین شانوں پر
گنگنا جس کا ابھی تک ہے بدن

رقص کرتا ہوا آتا ہے ابھی طفلک صبح

صبح آزادی زندان وطن

لڑکھڑاتے ہوئے اس بارگراں کے نیچے

بہکے بہکے ابھی پڑتے ہیں قدم

پھر بھی اک خلد نظر جنت کیف

مستی رقص سے ہر عضو حسیں نشہ میں چور

تن پہ زرتار سہ رنگی پوشاک

زعفران سبز وسفید

جس کے ہر دل کی گونجی ہوئی آواز میں ہے

قلب ہست کے دھڑ کنے کی صدا

شوق کی زندہ وتابندہ وپائندہ شبیہ

خواب ارماں کی سنہری تعبیر

لمحہ حاصل زیست جس کے سینے میں نہاں ایک نشاط ابدی

اس نظم میں آزادی کوایک پیکر عطا کر کے زخم خوردہ مسرت کا اظہار بھی ہے اور مستقبل کے خواب سے سرشاری کی کیفیت بھی نمایاں ہے۔''(۱)

## نظم ''سجدہ عقیدت''

کا شمار ملا کی اعلیٰ ترین نظموں میں ہوتا ہے یہ آزادی ملنے کی خوشی میں سرشار ہوکر لکھی گئی ہے۔ایک جانب یہ نظم مژدہ شادمانی سناتی ہے وہیں قلب شاعر میں جبر وظلم کے نظام فرعونیت کا خوف بھی جوان گنت روپ دھار کر کے انسانیت کا گلہ دباتا رہتا ہے، اس کا خوبصورت اظہار ملاحظہ کیجئے:

---

(۱) آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب ص ۱۴۷ ڈاکٹر محمد ذاکر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۸۱ء۔

محفل دہر میں جتنے بھی نظام آئے ہیں

لیکے سب مژدہ بہبودی عام آئے ہیں

پھر بھی ہے قافلہ آل بشر دشت نورد

گو چمن بن کے ہزاروں یہ مقام آئے ہیں

ابن آدم کے لئے جبر کے کتنے نئے دور

لے کے انسان کی مساوات کا نام آئے ہیں

ہاں سمجھتا ہوں بلندی میں نہاں ہے جو نشیب

پھر بھی کھاتا ہوں میں آج اپنی تمنا کا فریب

اک سجدے کو شناسائے جبیں اور کروں

دل کا اصرار ہے اک بار یقیں اور کروں

اے وطن سر پہ ترے تاج مبارک تجھ کو

یوم آزادی ہند آج مبارک تجھ کو

جادہ امن ملا کی بہترین نظم ہے۔ نظم میں ایک خاص ربط وتسلسل، فکروشعور کی پختگی حقیقت پسندی الفاظ کا مناسب استعمال اور نغمگی نظم کو وقار بخشتی ہے۔ ملا حوصلہ مند انسان ہیں اس لئے سخت سخت اور دشوار ترین لمحات میں بھی ان کے ہاتھ سے دامن عزم ہمت نہیں چھوٹتا وہ ہر برائی سے لڑنے کا حوصلہ رکھتے نظام عدل ومساوات سکون وعافیت کی فضا چار دانگ عالم میں عام کرنے کی تلقین کرتے ہیں، جوان کی فکر کی عظمت کی دلیل ہے، اس نظم کے یہ بند ملاحظہ کیجئے، دوسرا بند خاص توجہ کا مستحق ہے، اس غارت گری اور سفا کی کے عہد میں حیات انسانی اگر خطر میں ہے تو ادب کا دامن بھی محفوظ نہیں۔

لہو سے ہیں حدیث زندگی کی سرخیاں

بٹا ہوا ہے جنگجو صفوں میں یہ جہاں ابھی

زمیں کی فوج ہے ابھی سیاہ آسماں ابھی
حسیں افق حیات کا نظر سے ہے نہاں ابھی
کہیں تو خاک سے ملے گا آسماں بڑھے چلو
علم کیے شہید قوم کا نشان بڑھے چلو
بدل بدل کے رنگ بھر رہا ہے فتنہ جہاں
فن وادب کو پہنائی جارہی ہیں وردیاں
گرج رہی ہیں بدلیاں تڑپ رہی ہیں بجلیاں
ادھر سیاہ آندھیاں ادھر ہیں سرخ آندھیاں
ان آندھیوں کے درمیاں ہی درمیاں بڑھے چلو
علم کئے شہید قوم کے نشاں بڑھے چلو

وہ رہگزر حیات کی ہر وادی پرخار اور سنگلاخ راہوں کے باوجود نہایت عزم وحوصلہ سے شمع نور ہدایت لئے ہوئے سفر جاری رکھنے کے قائل ہیں۔ کسی بھی مرحلے میں تھک کر بیٹھ جانا ان کے مسلک کے خلاف ہے۔ وہ ہر لمحہ رحمت غیر معلوم پر یقین رکھتے اور گرمیوں کی تپتی دھوپ کے بعد ابر وباراں کی فرحتوں پر ایمان رکھتے ہیں یہی حوصلہ کامیابی کی کنجی ہوتا ہے۔

فنا کے رہگذار میں بھی جوئے زندگی لئے
خروش عقل میں نوائے دل کی بانسری لئے
شب بلا کشاں میں چشم تر کی چاندنی لئے
دیار سنگ وخشت میں بھی گل کی پنکھڑی لئے
غم جہاں میں چھیڑتے سرود جاں بڑھے چلو
علم کیے شہید قوم کا نشاں بڑھے چلو

وہ دیکھو دور سامنے ہیں زر نگار وادیاں
اک آخری سے موڑ پر ہے زندگی کا کارواں
نگاہ کائنات میں ہیں پھر نئی تجلیاں
تبسم افق میں ہیں خموش کچھ کہانیاں
انہیں خموشیوں کو سونپتے زبان بڑھے چلو
علم کئے شہید قوم کا نشاں بڑھے چلو

ملا کی تین نظمیں لہو کا ٹیکہ، معاہدہ شملہ اور شملہ کے درودیوار دلچسپ منظر نگاری کے ساتھ ملا کے جذبہ قومی کی عکاس ہیں۔ شملہ کی سرزمین وہاں کے درودیوار ابتدا ہی سے اپنی برفیلی چوٹیوں میں تہذیب وتمدن ہند کی ہزاروں کہانیاں چھپائے ہوئے ہیں۔ اس نظم میں ملا صاحب شملہ کے حسین مناظر وہاں کے جاہ وجلال سے کچھ زیادہ متاثر نظر آتے ہیں، ملاحظہ کیجئے:

جہاں کے عہد طفلی کے رفیقو اور دم سازو
میں جب بھی اپنے غم لے کے تمہارے پاس آیا ہوں
تمہاری گود میں سر رکھ کے پایا ہے سکوں میں نے
مرے جلتے ہوئے زخموں پہ تم نے پھائے رکھے ہیں
مجھے پھر سے دیا ہے زندگی کا حوصلہ تم نے
فسردہ دل کو پھر سے تازگی تم نے عطا کی ہے
مرے ادراک کو تم نے دیا ہے اک نیا عرفاں
یہ کچھ سانسوں کا جینا اور یہ وقتی سے ہنگامے
یہ دو اشکوں کے غم یہ چار لمحوں کی پریشانی
یہ دو ٹانگوں کے کیڑوں کی لڑائی ایک گھوڑے پر

ازل زادو

ابد کے راز دارو

آسماں یارو

تمہاری چھاؤں میں آ کر یہ سارے ہیچ لگتے ہیں

مجھے لگتا ہے جیسے تم

مرے بے مائیگی غم پہ چپکے چپکے ہنستے ہو

اور اپنی بے قراری پر

میں خود شرما سا جاتا ہوں

جس وقت ہندوستان کی پر عافیت زندگی میں چین نے ہندوستانی سرحدوں پر اپنی طاقت کے زعم میں چڑھائی کی تو وطن کا ذرہ ذرہ اس سے بے چین ہو اٹھا اردو کے شاعروں نے بھی قومی یک جہتی کا صور پھونکنے میں دقیقہ باقی نہیں رکھا اور غیرت کو للکار کر دشمن کو منہ توڑ جواب دینے کی تلقین، ملا جیسا حساس شاعر اور شیدائے وطن کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ انہوں نے لہو کا ٹیکہ جیسی نظم لکھ کر جذبہ وطن کو ابھارنے کی سعی مستحسن کی ہے۔ وہ وطن عزیز کے لئے سارے جوانان ہند اور مادر ہند کے جیالے سپوتوں سے لہو کا ٹیکہ لگا کر ملک کی عظمت وعزت کی حفاظت کیلئے اٹھ کھڑے ہونے اور وطن کے نام پر مر مٹنے کی تلقین کرتے ہیں کسی شاعر نے تو اپنے غم وغصہ کا اظہار یہاں تک کیا تھا:

چین کو چیں نہ بلادیں تو میرا نام نہیں

لائی (۱) تجھ کو نہ چبالیں تو میرا نام نہیں

نظم ''لہو کا ٹیکہ'' سے یہ بند ملاحظہ کیجئے:

گرا کر ہر نزاع درمیاں کی چار دیواری

سیاست کی دھڑے بندی زباں کی تفرقہ کار

---

(۱) لائی مراد ہے چین کا رہنما چاؤ ان لائی۔

مٹا کر صوبہ ایمان وملت کی حدیں ساری

ہمالہ پر نئی سرحد بنا دینے کا وقت آیا

وطن پر تجھ کو پیان وفا دینے کا وقت آیا

ہر اک مزدور و دہقاں کی پیشانی نم یارو

غریبوں کا لہو یارو امیروں کا درم یارو

ہر اک کشت دوکاں یارو ہر اک سیف قلم یارو

وطن کے داؤ پر سب کچھ لگا دینے کا وقت آیا

وطن پھر تجھ کو پیان وفا دینے کا وقت آیا

عدو کے مکروفن کا ہے عجب اک دوزخی منظر

تبسم اس کے رخ پر تو شعلے لب پہ اس رخ پر

ادھر کبلا کا ساغر ہے ہلاکو کا ادھر خنجر

اب اس یوسف کے بھائی کو سزا دینے کا وقت آیا

وطن پھر تجھ کو پیان وفا دینے کا وقت آیا

نقاب سرخ کے پیچھے ہے پہلی شکل خاقانی

وہی سفاک نظریں ہیں وہی بے چین پیشانی

وہی چنگیز کا جذبہ وہی خواب جہاں بانی

اب ان خوابوں کو مٹی میں ملا دینے کا وقت آیا

وطن پھر تجھ کو پیان وفا دینے کا وقت آیا

ملا کا جذبہ قومی اور وطنی ذیل کے بندوں میں ملاحظہ کیجئے، غالباً ملا سے قبل اقبال اور چکبست کے علاوہ کسی کے یہاں یہ کیفیت نظر نہ آئے گی:

خبر پہنچا دو اس خطرے کی اب ہر بزم انساں میں
درندہ پھاڑ کر دیوار پھر آیا ہے میداں میں
وہی دنیا نے پہلے بھی جب رکھا تھا زنداں میں

اٹھو پھر اک نئی دیوار اٹھا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمان وفا دینے کا وقت آیا

جوانان وطن آؤ قطار اندر قطار آؤ
دلوں میں آگ نظروں میں لئے برق و شرار آؤ
بڑھو قہر خدا اب ابن کے سوئے کارزار آؤ

جلال غیرت قومی دکھا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمان وفا دینے کا وقت آیا

اردو شعراء اور شاعری کے ضمیر میں امن و شانتی بھری ہوئی ہے شعراء جنگ سے زیادہ امن کے متلاشی ہوتے ہیں دسمبر ۱۹۷۱ء میں ہند و پاک جنگ میں ایک نیا ملک کرہ ارض پر بنگلہ دیش کی شکل میں نمودار ہوا اور ہر طرف افراتفری اور کشت خون کا سیلاب امنڈ پڑا شاعروں نے انسان دوستی کے موضوع پر اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھائے معاہدہ تاشقند کے موقع پر مخدوم نے کہا تھا:

جہاں میں جنگ نہیں امن سربلند چلے
نسیم صبح چلے باد تاشقند چلے

تو ملا نے شملہ کانفرنس کے موقع پر کہا تھا: ملا کی یہ آواز صدیوں کے تاریخی تسلسل اور اردو کی روایت کو ظاہر کرتی ہے:

فلک کے تاروں کو جھک جھک کے کیوں سلام کریں
خود اپنے گھر کے چراغوں کا انتظام کریں

زباں کا قفل بھی اک روز ٹوٹ جائے گا
ابھی دلوں کی خموشی کو ہم کلام کریں
سحر کی کرنوں میں گوندھیں نئی حیات کے باب
فسانہ شب ماضی کو اب تمام کریں

## ''قحط بنگال''

دوسری جنگ عظیم سے چھٹکارہ پا کر مشکل سے ابھی دم مارنے کی مہلت ملی تھی کہ ۱۹۴۲ء میں قحط بنگال کے قہر نے سر اٹھایا۔ ہندوستان چھوڑ و تحریک انگریزوں کے خلاف اپنے شباب پر تھی۔ اردو شاعروں نے ان موضوعات پر قلم اٹھائے ساحر اور وامق کی طرح ملا نے بھی قحط بنگال کو موضوع بنا کر نظم کہی تھی، ایک بند ملاحظہ کیجئے:

آج بنگال میں جاری ہے یہ فرمان اجل
گوشہ گوشہ میں ہے اک گور غریبان اجل
قافلہ غم کا ہے اور بیابان اجل
فاقہ مستی کا فسانہ ہے بعنوان اجل
تیرہ بختی کی ہر اک سمت جہاں داری ہے
سپہ یاس ہے اور بھوک کی سالاری ہے

ملا کے شدید ترین تاثرات میں ڈوبی ہوئی نظم سوغات ہے، جو انہوں نے ۱۹۵۱ء میں سفر پاکستان (لاہور) کے موقع پر کہی تھی۔ یہ نظم مسلسل کے فارم میں ہے، شوکت تھانوی نے ملا کو پاکستان میں سفیر اردو کا خطاب دیا۔ لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں ملا کو کوئی خطاب نہیں مل سکا۔ ملا کی یہ نظم صرف ملا کے دل کی بات نہیں بلکہ سبھی اہل ہند کے دلوں کی بات ہے، جو یقیناً بھلائی نہیں جا سکے گی۔

پھر اک تجدید الفت کا فسانہ لے کے آیا ہوں
میں کیا آیا ہوں اک گذرا زمانہ لے کے آیا ہوں

بہ نام خطہ اقبال میروغالب سے
سلام شوق ونذر دوستانہ لے کے آیا ہوں
فقط تھوڑا سا زمزم اس کے بدلے میں مجھے دیدو
میں گنگا کے دہانے کا دہانہ لے کے آیا ہوں

اس نظم کا پہلا ہی شعر ان کی عالی ظرفی، اور اردو کلچر پر فخر واحساس کا غماز ہے، بحیثیت مجموعی ملا کی نظموں کا بیشتر حصہ ملک وقوم سے محبت اور اس کی عظمت نیز اردو زبان وادب سے ان کے لگاؤ، اخوت و یگانگت مساوات اور حب بشر کی عکاسی کرتا ہے۔

## شخصی نظمیں:

اردو شخصی نظموں اور مرثیوں کا آغاز عہد غالب اور مومن سے ہوتا ہے۔ غالب نے اپنی بیوی کے بھانجے عارف کی موت پر ایک دردناک مرثیہ کہا اس کے بعد حالی کا مرثیہ غالب اور علامہ اقبال کے مراثی مرزا غالب اور داغ ادبی حیثیت رکھتے ہیں۔ چکبست نے بھی بش نرائن در تلک، گوکھلے جیسی قومی شخصیات کی اموات پر غم والم سے مملو ہو کر اس روایت کو آگے بڑھایا۔ آنند نرائن ملا نے بھی شخصی نظمیں اور مراثی کہے، جیسے مہاتما گاندھی کا خیر مقدم، مہاتما گاندھی کا قتل، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، بوڑھا مانجھی، نذر ٹیگور، سروجنی نائیڈو، مسز حامد علی، سردار پٹیل وگرونانک بوئے گم شدہ شہید امن جو اردو میں ایک گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

شخصی نظموں میں ملا کی نظم گاندھی کا خیر مقدم ہندوستان میں افریقہ سے واپسی کے موقع پر ہے۔ افریقہ میں ہندوستانیوں کی حالت زار وسقیم تھی وہ ہاں تجارت ومزدوری کی غرض سے جا بسے تھے جن کا ہر طرح سے وہاں استحصال کیا جارہا تھا گاندھی جی وہاں جا کر پہلی مرتبہ ان میں جذبہ خودداری اور جذبہ حریت پیدا کیا اور وہاں پہلی مرتبہ عدم تشدد کا پیغام دیا تھا ہندوستان واپس آ کر یہاں انہوں نے انگریزوں کے مظالم سے نڈھال ہندوستانیوں کی حالت اور بھی زیادہ ابتر دیکھی۔ انگریزوں کا تشدد اپنے بام عروج پر تھا،

اس کے ساتھ ہے آزادی کی تحریک بھی شدت اختیار کر چکی تھی۔ ایسے ماحول میں اہنسا کا پجاری فرشتہ صفت گاندھی کا ان کے درمیان پہونچنا صرف شاعر کیلئے ہی نہیں پورے ملک کیلئے نیک فال تھا۔ حالانکہ ملا سیاسی آدمی نہیں تھے اور نہ انہوں نے اپنے وقت کی سیاست میں حصہ ہی لیا۔ لیکن گاندھی جی کی لکھنؤ آمد سے ان کو بے حد مسرت ہوئی تھی۔ ان کے خیر مقدم میں یہ اشعار ملاحظہ کیجئے، جو ملا کے دلی جذبات اور احساسات کی کھل کر ترجمانی ہے اور اس کے ساتھ جذبہ قومی کے تحت گاندھی کو خراج عقیدت بھی ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں:

لذت تری باتوں میں مے صہبائے وطن کی
ہونٹوں پہ ہنسی ہے گل رعنائے وطن کی
آنکھوں میں تجلی سی ہے فردائے وطن کی
تو ایک جھلک ہے رخ زیبائے وطن کی

ہستی پہ تری ناز ہو جتنا ہمیں کم ہے
اس ملک کی قسم ترے ماتھے پہ شکن ہے

تو معنئ انساں ہے محبت کی ہے تصویر
تو شرح محبت کی اخوت کی ہے تفسیر
امید وطن کی تری ہمت پہ ہے تعمیر
تو قوم کی تدبیر ہے تو ملک کی تقدیر

آنکھوں میں نہاں ہیں ترے جلوے ابھی کچھ اور
برسے ہوئے بادل میں ہیں قطرے ابھی کچھ اور

تو نے یہ سبق خدمت قومی کا سکھایا
جو لب سے کہا پہلے اسے کر کے دکھایا
یوں عشق زبانی تو بہت سب نے جتایا
ہاں وقت پڑا جب تو تو ہی سامنے آیا

تیرا سا ہمیں چاہنے والا نہ ملے گا
ہمت کا دھنی قول کا سچا نہ ملے گا

اسی نظم میں ملا نے گاندھی کی کے تمام اوصاف کا نہایت موثر انداز میں ذکر کیا ہے۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ گاندھی قول کے دھنی اور ہمت و حوصلہ کے بلند مینار تھے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی قوم و ملک کی خدمت کے لئے وقف کردی تھی۔ وہ دوست کیا دشمنوں کے ساتھ بھی محبت و اخلاص سے پیش آتے تھے۔ ان کی ملکی خدمات اور قربانیوں کے سلسلے میں ملا کی یہ نظم ان کا بہترین خراج عقیدت ہے۔

## پنڈت موتی لال نہرو:

کشمیری پنڈتوں نے شعر و شاعر کے علاوہ ملکی سیاست میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا خصوصاً نہرو خاندان نے، ملا خود بھی کشمیری ہیں اور برہمن کشمیری ہیں اس لئے ان کے اندر فطری طور سے محبت کا جذبہ پیدا ہونا عام سی بات ہے اس ضمن میں ان کی تین نظمیں موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور بوڑھا مانجھی لائق ذکر ہیں۔ نظم موتی لال نہرو گیارہ بندوں پر مشتمل ہے اس میں ان کی موتی لال نہرو سے دلی عقیدت کے اظہار کے ساتھ ملا کی فکری اور شعری خوبیوں کی بھی تصویر ہے، ملا کی یہ عقیدت دیکھئے ان کا کہنا ہے اگر نہرو خاندان کی سوانح حیات معہ جہد آزادی کے قلم بند کی جائے تو دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہوگی:

جب مرتب ہوگا افسانہ ترا ہندوستاں
نام نہرو سرخ حرفوں میں رقم ہوگا وہاں
جہد آزادی کی دو جلدوں میں ہوگی داستاں
یعنی تیری اور جواہر کی سوانح عمریاں
کچھ تری باتیں ہیں کچھ تیرے پسر کا ذکر ہے
قوم کی تاریخ بھی تیرے ہی گھر کا ذکر ہے

## جواہر لال نہرو:

یہ نظم ۱۹۳۶ء میں کانگریس کے انچاسویں اجلاس منعقدہ لکھنؤ کے موقع پر کہی تھی۔ اس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو تھے، اس زمانے میں وہ یورپ کے سفر سے واپس ہوئے تھے، یہ نظم چھ بندوں پر مشتمل ہے، پہلا بند ملاحظہ کیجئے:

وطن میں کون پھر سردار چمن بن کے آتا ہے
چمن کی سمت ارمان چمن پھر بن کے آتا ہے
رخ غم پر تبسم کی کرن پھر بن کے آتا ہے
سوئے یعقوب بوئے پیرہن پھر بن کے آتا ہے
حکومت کو کیا تھا قید جس کو سرگراں ہوکر
وہی یوسف پھر آتا ہے امیر کارواں ہوکر

اسی نظم کا آخری شعر ہے:

ترے نقش قدم ہیں زر گلہ کے چپے چپے پر
ترے ایثار کی مہریں لگی ہیں ذرے ذرے پر

جواہر لال نہرو سے متعلق ملا کی دوسری نظم ''بوڑھا مانجھی'' ہے۔ ہندوستان اور چین کے درمیان جنگ کے زمانے میں اندرون ملک کچھ ایسی سازش سر اٹھارہ تھی کہ نہرو جی کو صدارت کانگریس سے ہٹا دیا جائے، جو کامیاب نہ ہوسکی۔ یہ نظم اسی پس منظر میں لکھی گئی ہے:

اے جوا ں سال میرے سہرابو
مجھ کو میداں سے ہٹانے کی کوشش نہ کرو
ورنہ پھر مانگ کے رستم کی طرح
مادر بحر سے اپنی وہ پرانی طاقت

تم سے آمادہ پیکار نہ ہوجاؤں کہیں
اورتمہارے یہ سفینے جنہیں سمجھے ہوتم آہن کے جہاز
میری اک پھونک سے سب کاغذی ناؤں کی طرح
منتشر ہوکے نہ اڑ جائیں کہیں
مانجھیو ساتھیو اے میرے رفیقو یارو
اے جواں سال میرے ہم سفرو
مجھ کو دھارے سے ہٹانے کی یہ کوشش نہ کرو

## نذر ٹیگور:

یہ نظم ملا نے بنگلہ زبان کے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کو خراج عقیدت کے طور پر کہی تھی، ٹیگور کی وہ ہستی ہے، جنہیں ۱۹۱۳ء میں ان کی ادبی خدمات کے صلے میں دنیا کا سب سے بڑا ایوارڈ نوبل پرائز ملا تھا۔ اس نظم میں غنائیت موسیقی اور کیف اوران کے شعروافسانے سے متعلق اپنے تاثرات ہیں:

شبیہ حسن ہے ترے نگار خانوں میں
سرور عشق جواں ہے ترے ترانوں میں
حیات رقص کناں ہے ترے فسانوں میں

کہ اک بہشت ترنم یا کلام ترا
خوشاوہ یاد جولائی زباں پہ نام ترا
وطن کے شاعر اعظم تجھے سلام مرا

ٹیگور کے ادب میں بلند مرتبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ملا کہتے ہیں:

وطن میں دھوم ہے ہر سمت اوستادوں کی
بساط شعر پر ایک فوج ہے پیادوں کی
تجھی پہ ختم ہوئی نسل دیودازوں کی

دوسرے اور تیسرے بند کا آخری شعر ملا کی عقیدتوں کا مظہر ہے، ملاحظہ کیجئے:

انساں وہ اٹھا جس کا ثانی صدیوں میں دنیا چن نہ سکی
مورت وہ نئی نقاش سے بھی جو بن کے دوبارہ بن نہ سکی
ناشاد وطن افسوس تیری قسمت کا ستارہ ٹوٹ گیا
انگلی کو پکڑ کر چلتے تھے، جس کی وہی رہبر چھوٹ گیا

چھٹے بند میں ملا نے گاندھی جی کی اعلیٰ صفات و بلند اخلاق کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو جاتا ہے اور آٹھویں بند میں ملا اپنی انسان دوستی کے جذبہ کے گاندھی جی کو انسانیت کا پیغمبر گردانتے ہوئے کہتے ہیں:

تاریخ میں قوموں کی گزرے کیسے کیسے ممتاز بشر
کچھ ملک زمیں کے تخت نشیں کچھ تخت فلک کے تاج بسر
اپنوں کیلئے جام وصہبا اوروں کیلئے شمشیر و قہر
نزد انسان پٹتی ہی رہی دنیا کی بساط طاقت پر

مخلوق خدا کی بن کے سپر میداں میں دلاور ایک تو ہی
ایماں کے پیمبر آئے بہت انساں کا پیمبر ایک تو ہی

دسویں بند میں ملا نے گاندھی جی کے مقصد کو دہرایا ہے، جس کی خاطر انہوں نے سینے پر گولیاں کھائیں اور خاص کر ''ایماں کی تنگ خیالی کو انسان کے غم کی وسعت دی'' بڑی معنویت اور وسعت رکھتا ہے۔ اس بند میں ملا کے بھی نظریات سامنے آجاتے ہیں ملاحظہ کیجئے:

پستی سیاست کو تو نے اپنی قامت سے رفعت دی
ایماں کی تنگ خیالی کو انساں کے غم کی وسعت دی
ہر سانس سے درس امن دیا ہر جبر پہ داد الفت دی
قاتل کو بھی گو لب نہ ہل سکے آنکھوں سے دعائے رحمت دی

ادب کے کوہ ہمالہ پہ ہے مقام ترا
خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا
وطن کے شاعر اعظم تجھے سلام مرا

## شخصی نظمیں یا شخصی مرثیے:

ملا کا پہلا شخصی مرثیہ مہاتما گاندھی کا قتل ہے، وطن کے اس عظیم رہنما کا دردناک قتل ۳۰ رجنوری ۱۹۴۸ کو شام کے وقت کمرے سے نکل کر پرارتھنا سبھا میں جاتے ہوئے نہایت بہیمانہ انداز میں ہوا تھا ایسی مثال شاید مشکل ہی سے ملے سکے گی۔ گاندھی جی ہر دلعزیز رہنما اور ملک کے سچے سپوت تھے۔ ان کے سوگ میں اردو کے بے شمار شعراء نے نذرانہ عقیدت پیش کئے تھے۔ یہ ساری نظمیں دردناک مرثیے ہیں جو صفحات اردو ادب میں نقش کالحجر بنکران کی یاد تازہ کرتی رہتی ہیں ایسے مراثی کہنے والوں میں جوش، آنند نرائن ملا، وامق جونپوری، جگر مرادآبادی، روش صدیقی، اسرارالحق مجاز، اثرلکھنوی، جمیل فطری، شمیم کرہانی، جاں نثار اختر اور اقبال سیل کے نام خاص طور سے لئے جاسکتے ہیں۔

ملا کی نظم مہاتما گاندھی کا قتل اردو کے شخصی مرثیوں میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم میں بارہ بند ہیں اس میں شک نہیں کہ گاندھی جی کی یہ موت دراصل ایک ایسا بہیمانہ اور درندہ صفت عفریت کی موت تھی، پہلا بند ملاحظہ کیجئے:

مشرق کا دیا گل ہوتا ہے مغرب میں سیاہی چھاتی ہے
ہر دل سن سا ہو جاتا ہے ہر سانس کی لو تھراتی ہے
اتر دکھن پورب پچھم ہر سمت سے اک چیخ آتی ہے
نوع انساں شانوں پہ لیے گاندھی کی ارتھی آتی ہے
آکاش کے تارے بجھتے ہیں دھرتی سے دھواں سا اٹھتا ہے
دنیا کو یہ لگتا ہے جیسے سر سے کوئی سایہ اٹھتا ہے

ہنسا کو اہنسا کا اپنی پیغام سنانے آیا تھا

نفرت کی ماری دنیا میں ایک پریم سندیسہ لایا تھا

ملا اور وامق کی نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''وامق اور ملا کی نظمیں صرف مہاتما گاندھی کی شخصیت کی عکاسی نہیں کرتیں بلکہ ان کے پیام کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔ وامق کی نظم کی عوامی اپیل زیادہ ہے۔ مگر ملا کی نظم ادب پارہ ہے۔''(۱)

## سروجنی نائیڈو:

یہ شخصیاتی مرثیہ سروجنی نائیڈو کی اچانک موت (۲/مارچ ۱۹۴۹ء) کے موقع پر لکھی گئی تھی۔ سروجنی نائیڈو بین الاقوامی شہرت کی حامل تھیں وہ انسانیت کے پرستار اور قومی اتحاد کی علمبردار سیاسی اور سماجی رہنما ہونے کے علاوہ انگریزی کی مشہور شاعرہ بھی تھیں۔ ان کی زندگی آخری لمحات تک ادیبوں شاعروں فنکاروں اور سیاسی شخصیات کی ایک بھیڑ سی ان کے یہاں رہتی تھی۔ ملا نے ان کی انگریزی نظم کا ترجمہ نوری عنوان کے تحت کیا ہے۔ شروع میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں ان کی استقامت عظمت ومحبت اور ادب نوازی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جمال شمع بھی پروانے کا گداز بھی تھی

ادائے ناز میں کیفیت نیاز بھی تھی

ادب کی جان تھی اور خود ادب نواز بھی تھی

سخن طراز عروس سخن سلام تجھے

جہاں ملی ہے حد کعبہ و صنم خانہ

جہاں یہ ختم ہے ہر تفرقہ کا افسانہ

وہاں یہ تو ھی مترنم دلوں کی سلطانہ

---

(۱) مقدمہ جوئے شیر آل احمد سرور ص ۱۷۔

زبان شیخ و لب برہمن سلام تجھے

غور طلب امر یہ ہے کہ جہاں کعبہ وصنم خانے کی حدیں مل جائیں وہاں کسی طرح کی عصبیت کا شائبہ نہیں ہوتا ہے زبان پہ شیخ و برہمن کہہ کے ملا نے مرحومہ کو ایک نئے انداز میں نذرانہ پیش کیا ہے۔

بقول آل احمد سرور:

''ہماری سیاست اور ادب پر ان کے گہرے نقوش ہیں مگر ہماری تہذیب پر ان کی شخصیت کا لازال اثر ہے۔'' ذیل کے اشعار میں ان کی تہذیبی صفات کو بڑی خوبی سے ملا نے اجاگر کیا ہے، ملاحظہ کیجئے:

خزاں کی فصل میں بھی نکہت بہار رہی
وطن کے دور جنوں میں بھی ہوشیار رہی
خروش بزم میں بھی تو ترانہ بار رہی
جھموں میں نسیم عدن سلام تجھے

غرور قومیت و دیں کے کوہساروں میں
نفاق نسل وتمدن کے ریگزاروں میں
الگ الگ سے حیات جہاں کے دھاروں میں
ترانہ دل گنگ وجمن سلام تجھے

## گرونانک:

ملا کو وطن کے بزرگ رہنما گرونانک سے بھی خاص عقیدت ہے ان کی بھگتی تحریک اور خدا پرستی سے متاثر ہو کر اقبال نے بھی کہا تھا:

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

ملا نے گرونانک کے یوم ولادت کے جشن کے موقع پر ایک قطعہ کہا تھا، جس کا ذکر بہر حال قطعات

کے ذیل میں ہونا چاہئے تھا مگر چونکہ یہ شخصی قطعہ ہے، اس لئے اسے یہاں جگہ دی گئی ہے:

کثافت زندگی کی ظلمت میں شمع حق ضوفشاں کہئے
جہاں کی بجھتی ہوئی نگاہوں کو جگمگاتا ہے نام نانک
نہ پاک کوئی نہ ناپاک کوئی اونچا نہ نیچا
گروکا یہ میکدہ ہے اس جا ہر ایک کو ملتا ہے جام نانک
یہاں مئے آ کے تفرقے سب وہی نہ آلودگی کوئی بھی
یہ حرف الفت بطو رعرفاں یہ عرش انسان پہ نام نانک

## ذاکر حسین:

''بوئے گمشدہ'' چودہ اشعار پر مشتمل یہ نظم ایک شخصی مرثیہ ہے، جو ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند کے سانحہ ارتحال پر لکھا گیا تھا۔ اس میں ملا نے اپنی واردات قلبی کا اظہار نہایت ایمائی کیفیت کے ساتھ کیا ہے، نظم کے آخری تین اشعار دیکھئے:

ایک ہی شمع بجھی موت کے ہاتھوں لیکن
کتنی تاریک ہوئی قوم کی منزل ساقی
اک کلی آئی تھی خوشبو لئے کم دم کیلئے
رہ گئی پھر وہی کانٹوں کی محفل ساقی
دفن ہو جائے نہ خوشبو بھی کہیں پھول کے ساتھ
یہی خوشبو تو ہے اس بزم کا حاصل ساقی

غرض کہ ملا نے مہاتما گاندھی، نہرو، ٹیگور، سروجنی نائیڈو، گرونانک، ذاکر حسین، لال بہادر شاستری اور اندرگاندھی جیسے عظیم رہنماؤں کو اپنی شاعری کے حوالے سے اس طرح نمایاں کیا ہے کہ یہ شخصیات ہندوستان کے عظیم ہیرو یا سچے سپوت بن کر نمایاں ہوئی ہیں۔

## مسلک انسانی

اردو شاعری میں انسان دوستی کا یہ نظریہ تصوف کے راستے سے آیا۔ اسے صوفی بزرگ اور سادھو سنتوں نے عروج دیا۔ اردو شاعری میں امیر خسرو، خواجہ میر درد، امیر مینائی وغیرہ نے اپنی شاعری میں عظمت انسانی کے ترانے گائے ہیں۔ عہد حاضر میں اگر کسی شاعر نے کعبہ وصنم خانہ یا تسبیح وزنار کے دائرے سے باہر نکل کر انسان کے درد کا احساس کیا ہے تو وہ بلا خوف تردید آنند نرائن ملا ہیں، ملا کی شاعری کا اصل محور انسان ہے اور اس عاشق انسانیت اخوت کے فدائی کے کلام کو اگر صحیفہ انسانیت کا نام دیا جائے تو یقین ہے کہ حق بجانب ہوگا۔

## انسان:

ملا کی مشہور نظم چھ بندوں پر مشتمل ہے، اس میں ملا نے انسان کی حقیقت کو نمایاں کیا ہے۔ بلکہ خاص طور سے یہ واضح کیا ہے کہ انسان خود ہی ابھی تک اس راز سے ناواقف ہے کہ وہ دراصل ہے کیا! حالانکہ اس کے جلوہ ہائے صد رنگ ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ کبھی موسیٰ کے روپ میں آتا ہے کبھی سلیمان بن کر اور کبھی شداد وفرعون کے روپ میں کبھی مجنوں وفرہاد، مانی وبہزاد بن کر پھر بھی اس راز سے آگاہ نہیں کہ وہ ہے کیا۔ نہ وہ جانتا ہے روح کا وجود کیا ہے یہ جسم میں ہے تو کیوں اگر ہے تو ہمیشہ رہتی کیوں نہیں عقل یہ سمجھنے میں مجبور محض ہے، انسان تقدیر کا غلام ہے، ظالم بھی ہے مظلوم بھی ہے حاکم بھی رعایا بھی، کبھی وہ خدا کے وجود کا قائل ہے اور کبھی اس کا منکر، ملا کا خیال ہے کہ زندگی خود ایک منزل ہے اس لئے اسے کامیاب بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

کون ہے میرے سوا مالک افلاک وزمیں
نور فردا ہے جس میں وہ میری ہے جبیں
قصہ دہر میں لیکن مجھے معلوم نہیں
اہرمن ہوں کہ سلیماں ہوں کہ خاتم کا نگیں

طور ہوں جذبہ موسیٰ ہوں کہ فرعون ہوں میں
لب خاموش بتادے یہ مجھے کون ہوں میں

نور جاں پیکر خاکی میں فروزاں کیوں ہے
مجھ میں پنہاں ہے تو پھر مجھ سے گریزاں کیوں ہے
جسم اور روح کا آپس میں یہ پیماں کیوں ہے
عقل سے شوق مرا دست گریباں کیوں ہے

دوست کس کو کہوں کس کو کہوں دشمن اپنا
رہنما کون ہے اور کون ہے رہزن اپنا

شاعر متجسس ہے کہ روح نورانی ہے اور جسم میں کیسے روشن ہے اگر اس میں وہ ہے تو دکھائی کیوں نہیں دیتی اور ہمیشہ جسم کا ساتھ کیوں نہیں دیتی، جسم و روح کا تعلق عقل کی سمجھ سے بھی باہر ہے رواں اناوی نے خوب کہا ہے:

کھل نہیں سکتا کبھی ہرگز یہ راز
بے محل ہے مذہبوں کی ترک وتاز

ملا کو ایک اور فکر یہ بھی ہے کہ آخر جسم اور روح کون کس کا دوست ہے، کون کس کا دشمن۔ اس نظم میں آگے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ انسان دنیا کا وارث ہے اس کا دل ہمیشہ تاریکی میں رہتا ہے وہ خدا کے دیدار کا شائق ہے لیکن مجبور ہو کر یہ سوچتا ہے یہ دنیا جسے وہ ایک بحر بیکراں سمجھتا ہے کہیں ساحل نہ ہو یہ زندگی کی راہ اس کی منزل نہ ہو۔ بہر حال یہ معمہ ان کی نگاہ میں بھی لاینحل رہ جاتا ہے مختصراً اس نظم کے بارے میں صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ ملا نے انسان دوستی کے جذبے سے حیات انسانی کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے۔

''میری دنیا'' ملا کی ۱۶/ اشعار کی نظم ہے، اس کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں دس اور دوسرے جزو میں سولہ اشعار ہیں۔ اس نظم میں ملا نے انسان کے منفی پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے، ان اشعار میں ان کا شدت

احساس ملاحظہ کیجئے آج کا انسان کیا سے کیا ہو گیا ہے:

دل کانپتا ہے میرا انساں کی طاقتوں سے
لگتا ہے خوف مجھ کو اونچی عمارتوں سے
لاشوں پہ ہے بنائے ایوان کامیابی
چونے کی جگہ لہو ہے اینٹیں ہیں ہڈیوں کی
سینچی ہوئی لہو سے سب تیری کیاریاں ہیں
مسروقہ دولتوں پر سرمایہ داریاں ہیں
چٹکی میں مل گیا جو اس کو مسل ہی ڈالا
زیر قدم جو آیا کچ سے کچل ہی ڈالا
انساں اتر رہا ہے رسم درندگی پر
تہذیب آ گئی ہے حد برہنگی پر
کیا جہد زندگی میں طبع بشر یہی ہے
سو بار موت بہتر جینا اگر یہی ہے

آج کے زمانے میں خود غرضی، مفاد پرستی اقتدار کی خواہش بصورت جنگ جاری ہے۔ انسانی قدریں پامال ہو چکی ہیں، طاقت ور کمزور کو پیس رہا ہے اس کی وجہ امن وسکون کی فضائیں معدوم ہیں، یہ ہماری قوت ارادی کا ضعف ہے کہ ہم کسی احتجاج کے حالات سے سمجھوتے پر تیار رہتے ہیں۔ لیکن مستحکم قوت ارادی کے مالک ایسے حالات سے لوہا لیتے اور ایسا نظام لانا چاہتے ہیں، جس کی بنا انسانیت پر ہو، عہد حاضر کے ناگفتہ بہ حالات میں ملا ایک صالح معاشرے کے متمنی ہیں نظم کے دوسرے حصے کے یہ چند اشعار دیکھئے:

اک بار دور گردوں ایسا نظام بھی ہو
جس میں ہر ایک میکش صہبا بہ جام بھی ہو

مظلوم کا کلیجہ تیر ستم نہ ڈھونڈھے

ایوان شادمانی بنیاد غم نہ ڈھونڈھے

انسان عامیانہ راہوں سے ہٹ چکا ہو

پیشانی بشر کا تیور پلٹ چکا ہو

انسانیت کا پودا ٹھٹھرے نہ جس ہوا میں

دل کا بھی سانس لینا مشکل ہو جس فضا میں

ایسی زمیں بھی کوئی کیا زیر آسمان ہے

میرے خیال بتلا دنیا مری کہاں ہے

ملا مصائب انسان اور مسائل انسانیت سے آگاہ ہیں۔ وہ خوب واقف ہیں کہ تیسری جنگ عظیم کے دہانے پر دنیا کھڑی ہے اور ہر جانب تاریکیوں کے گھنگھور بادل منڈلا رہے ہیں پھر بھی ایک فنکار کی حیثیت سے وہ انسان کی فلاح اور بہبود کی بات کرتے ہیں، شاعری کا یہی وصف اسے جز و پیغمبری کا درجہ عطا کرتا ہے۔

## ''جہاں میں ہوں''

۷ اراشعار کی نظم میں ملا نے اس اضطراری کیفیت کا اظہار کیا ہے کہ انسان نے خود کو حرص و ہوس، قتل ومنافرت عصبیت سخت دلی خودغرضی مذہبی لسانی غرضکہ ہر طرح کی برائیوں میں مبتلا کر رکھا ہے، جس سے پورا انسانی سماج تباہ ہو رہا ہے ملا کی آرزو ہے کہ کاش وہ دن آتا جب ایک صحت مند سماج اور جہان نو کی تعمیر ہوتی اور انسان افضل الخلایق بن سکتا۔ اس نظم سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

وہی حرص و ہوس کا تنگ زنداں ہے جہاں میں ہوں

وہی انساں وہی دنیائے انساں ہے جہاں میں ہوں

کبھی شاید یہ محفل بھی ستاروں سے چمک اٹھے

ابھی تو اشک بے کس سے چراغاں ہے جہاں میں ہوں

کبھی شاید فرشتہ آدم خاکی بھی بن جائے
ابھی تو بھیس میں انساں کے شیطاں ہے جہاں میں ہوں
ابھی روئے حقیقت پر پڑا ہے پردہ ایماں
ابھی انسان فقط ہندو مسلماں ہے جہاں میں ہوں
مجھے بھی شوق آزادی ہے لیکن کیا کروں اس کو
میرے چاروں طرف زنداں ہی زنداں ہے جہاں میں ہوں

## ''اور اک دن انسان جیتے گا''

ملا کی ایک قابل قدر نظم ہے، یہ نظم شاعر کے گہرے سماجی اور تاریخی شعور کا پتہ دیتی ہے یہ نظم چار حصوں میں منقسم ہے اس میں انہوں نے مختلف تلازموں سے خیر کی ہار اور شر کی جیت دکھائی ہے:

پھر معرکہ خیر و شر میں نیکی ہاری شر جیتا
یہ جنگ مگر جاری ہے ابھی
پھر دشت و چمن کے معرکے میں گلشن ہارا صحرا جیتا
یہ جنگ مگر جاری ہے ابھی
حق اور ناحق کے معرکے میں پھر حق ہارا ناحق جیتا
یہ جنگ مگر جاری ہے ابھی
جب سے یہ دنیا قائم ہے یہ جنگ برابر جاری ہے
اب تک تو یہی ہوتا آیا انساں ہارا شیطاں جیتا
لیکن جب تک یہ دنیا ہے
یہ جنگ بھی ہوتی جائے گی میداں بدلتے جائیں گے
اور اک دن انسان جیتے گا

ملا کو یقین کامل ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ انسان ضرور جیتے گا۔ اس یاس بھری فضاؤں اور ماحول کی ان سچائیوں کے باوجود ملا مایوس نہیں ہیں بلکہ انہیں امید ہے اور پختہ ہے آخر ایک دن انسان کی فتح ہوگی، ان کی ایک نظم ''سحر وشب'' میں بھی اسی طرح کا خیال نظر آتا ہے:

رات کٹتی ہی نہیں
سحر آتی ہی نہیں
مگر امید سی ہے کہ دل انساں کو
اک دم کیلئے چھوڑ کے جاتی ہی نہیں
ارتقا ہے اسی امید کا نام
اور ہنسی کی رگوں کو یہی دیتی ہے لہو
سوز ہر ساز یہی خالق فردا ہے یہی
ہر افق کے رخ شب تاب کا غازہ ہے یہی
دل کی دھڑکن ہے یہی فیض کا نغمہ ہے یہی

## ''گمراہ مسافر''

میں ملا نے اپنے موضوع کی افادیت کے اعتبار سے انسان کی ان تلخیوں کی طرف اشارہ کیا ہے، جبکہ وہ ایسے نظام کا خواہاں ہے کہ اسے امن وسکون کی بے خطر فضا میں سانس لینے کا اور انسانی قدتک پہونچنے کا موقع نصیب ہوسکے اس کے برعکس ابتدائے آفرینش سے ہی اس کا یہ المیہ ہے کہ اس کو آج تک ایسا کوئی راستہ نہیں ملا اور وہ تخلیق آدم سے اب تک گمراہیوں کے جنگل میں پھنسا ہوا بہک رہا ہے:

دنیا کے اندھیرے زنداں سے انساں کو بہت چاہا نہ ملا
اس غم کی بھول بھلیاں سے باہر کا کوئی رستہ نہ ملا
اہل طاقت اٹھتے ہی رہے بھاری بھاری تیشے لے کر

دیوار پس دیوار ملی دیوار میں دوازہ نہ ملا
جراح فرد آتے ہی رہے صد مرہم اکسیری لے کر
جو زیست کے زخموں کو بھر دے ایسا کوئی پھاہا نہ ملا

ملا صاحب کی آرزو ہے کہ معاشرے کا پورا ڈھانچہ انسانی ہمدردی میں ڈوب جائے اور ایک ایسا نیا نظام پیدا ہو، جس میں ہر فرد دوسرے کے غم کو اپنا غم سمجھے، تہذیب کے ایسے نقوش ابھریں کہ جن میں انسانیت اور خلقت انسان کی فطری چھاپ ہو۔

**"ارتقا"**

اقبال نے زندگی کو متحرک تصور کیا ہے اسی بنا پر انہوں نے ابلیس و مومن کے ہیولے تیار کئے، ملا نے ابلیس و مومن تو نہیں تخلیق کئے بلکہ ایک ایسا انسان ضرور بنایا، جو بیک وقت فرشتہ بھی ہے انسان بھی۔

یہ نیک بھی ہے بد بھی شیطاں بھی ہے فرشتہ بھی
انسان کو کیا کہئے ہر سطح پر انساں ہے

اسی موضوع پر ملا کئی نظمیں ہیں، جوئے شیر میں ارتقا کا عنوان دے کر انہوں نے بارہ اشعار کی ایک نظم شامل کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

اوپر اوپر سل بہ سل رکھے گئے احکام جبر
تہ بہ تہ سوتے بغات کے ابلتے ہی رہے
دیر تک رہتی نہیں اک جام میں صہبائے زیست
اس میں وہ تندی ہے پیمانے چھلکتے ہی رہے
تیرگی بڑھ بڑھ کے تاروں کو بجھاتی ہی رہی
تیرگی کو چیر کر تارے نکلتے ہی رہے
حرف آخر بن کے اترا ہر نیا آئین دہر

پھر بھی باب زیست کے عنواں بدلتے ہی رہے
ارتقا کی راہ میں رکنا ہی ہے انسان کی موت
ہیں وہی زندہ جو اس رستے پہ چلتے ہی رہے

ملا کا خیال ہے کہ کوئی نظام زندگی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نہیں ہوسکتا اچھے سے اچھا قانون بھی زنجیر بنا کر نہیں پہنایا جاسکتا۔ انسان کی فطرت میں جمود و تعطل سے زیادہ اس کی نظر میں ارتقا وہر آن متبدل رہنے کی خو ہے اس لئے اس کے قدم رک نہیں سکتے۔ ان کے خیال میں یہی وہ سیڑھی ہے، جو ارتقا کی طرف لے جاتی اور لے جاسکتی ہے۔ لاکھوں برسوں سے خیر وشر، حق و باطل میں ٹکراؤ ہوتا رہا اور اب تک یہ جنگ ختم نہیں ہوئی ہے۔ ملا رجائیت کے امین بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا پیغمبر ہیں۔ وہ ہر تنگ و ترش میں سیاہ وسفید میں فتح وشکست میں جہد مسلسل کی وکالت کرتے ہیں۔

خستگی و تشنگی و رہزن وریگ سراب
کتنی صدیاں ہوگئیں انسان چلتا جائے ہے
جہاد زیست کے تپتے ہوئے بیاباں میں
اٹھائے سحر شجر سایہ دار ہیں کیا کیا

## سماجی نظمیں:

ملا کی شاعری میں سماجی اور سیاسی موضوعات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ایک جانب ان کی نظمیں محبت کی تصویر، رنگ و بو کے ترانے بن کر سامنے آتی ہیں تو ساتھ ہی وطن کے سیاسی اور سماجی کوائف کو بھی بیان کرتی ہیں۔ چند نظمیں وقتی اور ہنگامی موضوعات کی تصویر کشی بھی کرتی ہیں۔ ان میں ایسا جوش وجذبہ نظر آتا ہے کہ جیسے کسی واقعہ کے رونما ہوتے ہی قلمبند کردی گئی ہیں۔ کیونکہ ان میں جوش وابال گہرائی اور گیرائی کم ہوتی ہے یہ کیفیت خاص ان نظموں میں زیادہ نظر آتی ہے، جنہیں سیاسی نظمیں کہا جاسکتا ہے۔ ان کی سماجی نظموں میں زیادہ تر سماج اور معاشرے کے منفی پہلوؤں پر ضرب لگائی گئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فرد

اجتماعیت کے حصار میں ایسا ذہنی اور فکری طور سے مقید ہے کہ کھل کر اپنی ذاتی رائے کا اظہار بھی نہیں کر سکتا ہے۔ ملا کی نگاہ معاشرے کے ان پہلوؤں پر بھی ہے، جہاں تک ابھی بہتوں کی نظر بھی نہیں جا سکی ہے، بقول علی جواد زیدی:

''ملا کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہر جگہ ان افراد واقعات وعلائم کو سطحیت سے بچایا ہے اور گمبھیر تفکر اور انسانیت دوستی کی مدد سے ان کی سماجی معنویت کو اجاگر کیا ہے۔''(۱)

## نقابیں

عہد حاضر ایسے افراد سے خالی نہیں ہے کہ جن کا ظاہر کچھ اور ہے اور باطن کچھ اور۔ ایسے افراد اپنے ظاہری طور طریق تحریر وتقریر سے گرویدہ تو کر لیتے ہیں مگر بیشتر حالات میں نتیجہ صرف سراب نظر اور دھوکہ ہوا ہے۔ سماج کے انہیں عناصر کی طرف ملا نے اس نظم میں اشارہ کیا ہے، نظم کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

شاعر کبھی دل میں نہ اٹھا جن کے کوئی درد
الفاظ پرونے کا مگر لے کے سہارا
اس نے غم کاذب کے ہر ایک رخ کو ابھارا
اشکوں کے ترانے
آہوں کے فسانے
دنیا کو یقین آ ہی گیا صاحب دل ہے
اک عارف غم ہے

ایک دوسرا روپ بھی آج کے انسان کا ملا نے اسی نظم میں دکھایا ہے وہ ہے اصلی چہرے والا، جو اپنی غیرت وخودداری بے کسی وبے مائیگی غم گینی اور چرب زبانی کے فقدان کی بنا پر اپنی دکھ بھری آپ بیتی نہیں کہہ پاتا اور سماج بھی ان اصلی چہرے والوں کی طرف کبھی نگاہ نہیں کرتا بلکہ بیشتر حالات میں نظر انداز کرتا ہے:

---

(۱) سیاہی کی ایک بوند ص ۷ علی جواد زیدی۔

اک کشتۂ غم جس کی ہر ایک سانس ہے ایک ٹیس

محروم زباں ہے

ہر حسن بیاں سے

اک ٹوٹے ہوئے دل کی حقیقت کو کہے کیا

اشکوں میں ستارے ہیں نہ آنکھوں میں شرارے

اس کے غم خاموش کو کوئی بھی نہ سمجھا

دنیا میں نہیں کوئی حقیقت کا پرستار

ہر سمت نقابوں ہی نقابوں کے خریدار

اسی موضوع سے متعلق ملا کا ایک شعر ہے:

دنیا ہے نقابوں کا میلہ نقلی چہرے جھوٹی باتیں

اوڑھے ہے ردائے شبنم جو اکثر شرر اندام بھی ہے

## رشوت

عام مشاہدہ ہے کہ اکثر نا اہل و بغیر کسی لیاقت و قابلیت یا محنت و مشقت کے اونچی کرسیوں اور منصبوں پر فائز ہو جاتے ہیں حالانکہ ان کی بساط کاغذی ناؤ جیسی ہوتی ہے، جسے استحکام نہیں۔ عہد حاضر کے سماج کی ان ہی خامیوں کو ملا نے اس نظم میں ایک چھوٹی سی کنکری کو علامتی روپ دیکر بڑے سلیقے سے قلمبند کیا ہے:

آیا جو ہوا کا ایک جھونکا

پربت کی اونچی چوٹی سی

ننھے منے سے کچھ کنکر

چٹان بنے جو بیٹھے تھے

وادی میں لڑھک کر آ کے گرے

جس خاک سے اڑ کر پہونچے تھے اس خاک پہ پھر واپس آئے
کچھ کھسیائے کچھ جھنجھلائے
اور اپنی جھینپ مٹانے کو
کچھ چیخے اور کچھ چلائے
جب کچھ نہ چلی
تب یہ کہہ کر
اک دوسرے کو سمجھانے لگے
اک ادنٰی اور کم ظرف بشر
چوٹی پہ پہونچ تو سکتا ہے
لیکن اس کا
چوٹی پہ ٹھہرنا مشکل ہے
پھر کان میں چپکے سے بولے
جب تک نہ ہوا کو رشوت دے

**ھپّی:**

اردو شاعری میں جدیدیت کا تصور صرف فرد ہی کی ذات تک محدود رہتا ہے۔ اجتماعیت کو کوئی دخل نہیں فرد ہی سب کچھ ہے، ملا صاحب نے ایک ہپی کی زبانی سے نہایت جزرسی اور باریک بینی س سب کچھ بیان کردیا ہے:

کل سر راہ مل گیا مجھ کو
ایک ہپی نہ جانے زن یا مرد
بالیاں کانوں میں گلے میں ہار

موئے سر بار دوش پیٹھ کا درد
ننگے سر پاؤں میں پھٹی چپل
سر سے پاک بدن پہ غازہ گرد
صلح اتنی مذاق بزم سے صرف
جسم کی آڑ جانگیا اک زرد
گیسوؤں میں جنوں جواں زندہ
ہر نظر سرخیٔ حدیث نبرد
اک جھولے میں کچھ متاع حیات
ایک شانے پہ زیست راہ نورد

شاعر ہپّی سے پوچھتا ہے کہ آخر تیرے دل میں کون سا سودا ہے کہ تو جس کیلئے حیران و پریشان ہے۔ اس کے جواب میں ہپی کہتا ہے میں نے سماج اور اجتماعی تصور سے بغاوت کر لی ہے اس لئے کہ سماج اقدار و روایت سب بیکار سی شے ہیں آدمی ان سماجی اور مذہبی زنجیروں میں غلاموں کی طرح جکڑا ہوا ہے وہ طرح طرح کے نظریات اور مسلکوں کا غلام ہے آزاد پیدا ہونے کے باوجود وہ سماج میں آزاد نہیں ہے۔ عہد طفولیت سے ہی وہ اجتماعیت کا اسیر بنا دیا گیا ہے اگر وہ کچھ کرتا دھرتا ہے تو سماج اس کی بخیہ ادھیڑ کر رکھ دے گا۔ اس لئے وہ مجبوراً سماج کے اشارے پر لٹو کی طرح ناچے گا، ملا اس سے سوال کرتے ہیں:

میں نے پوچھا مرے جواں باغی
کون سودا ہے دل میں کیا ہے درد
بولا تم کیا سمجھ سکو گے بھلا
خوں تمہارا روایتوں سے ہے سرد
نسل انساں غلام ہے اب تک

انجمن میں ابھی اسیر ہے فرد

آج دو پیڑھیوں میں ہے اک جنگ

سن رسیدہ سے نوجواں کی نبرد

سبز پتے ابھر نہیں پاتے

شاخ پر یوں جمے ہیں پتے زرد

خوان پیری میں گرم نان وکباب

نوجوانوں کے واسطے دم سرد

اس کے بعد وہ ہی کہتا ہے کہ میں آج ایک آزاد فرد کی طرح سماج سے برسر پیکار ہوں مجھے اگر سمجھنا ہی چاہتے ہو تو میری انسانی جکڑ بندیوں سے ذہن کے گرد وغبار کو جھاڑ پھونک کر ہماری طرح دیوانگی کا روپ اختیار کرنا ہوگا۔ سماجی قدریں سب کھوکھلی ہیں ان کے عقائد میں کوئی دم نہیں ہے۔

آج ہے مورچہ جمائے ہوئے

بزم کے سامنے برہنہ ہر فرد

میرے ساتھ آؤ بن کر دیوانہ

ذہن انساں سے جھاڑدیں کچھ گرد

کھوکھلی ہوچکی ہیں سب قدریں

راہ اخلاق صرف گرد ہی گرد

ان عقیدوں میں کوئی تاب نہیں

جن پہ صدیوں کی جم چکی ہے گرد

پچھلے سارے نظام کہنہ اور بوسیدہ ہو چکے ہیں، اب فرد آزادی سے اپنی ایک نئی انجمن تشکیل دے گا اس پر شاعر سوال کرتا ہے ہپّی زوردار قہقہہ لگا کر کہتا ہے ''شعلہ باچوبہائے خشک چہ کرد''، یعنی وہی جو سوکھی

لکڑی کے ساتھ شعلہ کرتا ہے'' چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

علم کا کارواں وہاں پہونچا
آسمانوں سے چھن رہی ہے گرد
چشم انساں میں کوئی خواب نہ داب
دل انساں میں کوئی درد نہ ورد
جسم ہی جسم کی ہے ساری بھوک
اور یہ بھوک ہی ہے سارا درد
ہوچکا کہنہ یہ نظام جہاں
اک نئی انجمن بنائے گا یہ فرد
میں نے پوچھا کہ حشر کیا ہوگا
مان لو انجمن سے جیتا فرد
اس نے سن کرکے قہقہہ مارا
جس کے پرلے میں اک پیام نبرد
اور الٹ کر سوال مجھ سے کیا
''شعلہ با چوب ہائے خشک چہ کرد''

سپنے: اس نظم میں ملا نے یہ بتایا ہے کہ ہر انسان کے اندر ایک چھوٹا سا بچہ یعنی معصومیت موجود رہتی ہے، جو حقیقت میں زندگی کا ساتھی ہے اسی پر زندگی منحصر ہے از ابتدا تا انتہا وہ خواب دیکھتا رہتا ہے یہی رنگارنگ خواب اس کی ترقی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، نظم ملاحظہ کیجئے:

ہر اک انساں کے سینے میں چھپا
ایک چھوٹا سا بالک رہتا ہے

جو اس کا جیون ساتھی ہے
اور سپنے دیکھتا رہتا ہے
انسان مٹی بالک جوالا
اور انگلی پکڑ کر اس بالک کی
جیون کے اندھیرے رستوں پر
انسان چلتا رہتا ہے

یہ سچ ہے کہ اگر انسان آئندہ کے دل خوش کرنے والے خواب دیکھنا بند کر دے تو اس کی ترقی کی سبھی راہیں مسدود ہو کر رہ جائیں کیونکہ انہیں خوابوں یا توقعات کے سہارے وہ ان کے حصول کے لئے فکر و کوشش کرتا، تگ و دو کرتا اور دکھ جھیلتا ہے، اور آخر کار کامیابی کا حصہ بن جاتی ہے اس کا وجود قالب بے روح ہو کر ایک دن ختم ہو جائے گا یہی خواب اس کی ترقی کا راز ہیں۔

یہ سپنے میرے لئے کیا ہیں
میں کچھ بھی نہیں سپنے سب کچھ
یہ میرا رشتہ ہیں کل سے
یہ رشتہ ہی جیون ہے میرا
جس روز یہ رشتہ ٹوٹ گیا
میں اپنا بالک کھو دوں گا
اس جیون کے اندھیارے میں
اک اندھا بن کر بھٹکوں گا
او رمٹی میں مل جاؤں گا
چھینو نہ میرے سپنے مجھ سے

## آنند نرائن ملا کی رومانی نظمیں:

ملا اپنے گرد و پیش کے اور سماجی حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور ان سب کا اظہار انسانی ہمدردیوں کے پیرائے میں نہایت موثر انداز میں کرتے ہیں۔ ان حقائق سے ماورا انہوں نے کچھ رومانی نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں ''پرستار حسن'' ان کی پہلی نظم ہے، اس کے علاوہ ''سماج کا شکار''، ''مریم ثانی'' بالخصوص ''ٹھنڈی کافی'' لائق ذکر نظمیں ہیں۔ پرستار حسن میں گیارہ بند ہیں یہ نظم مسدس کے پیرائے میں ہے فطرت انسانی کا مقتضا تلاش حسن ہے اور اس کا منشائے دل اس حسن مطلق تک رسائی ہے۔ لیکن ناکام رہ جاتا ہے۔ عقل و دانش کی رہبری میں وہ رسائی چاہتا ہے لیکن پھر بھی ناکام رہ کر وہ شعور و وجدان سے کام لینا شروع کرتا ہے۔ اس میں ملا کے فکری عنصر کا لائق ذکر پتہ چلتا ہے، ملا کا انداز ملاحظہ کیجئے:

حسن سے میری غرض جز و خوبیِ قسمت نہیں
جز و پرستش کے میرے دل کی کوئی حاجت نہیں
گرمیِ شوق تمنا سے مجھے رغبت نہیں
حسن کے بندے جو ہیں وہ بندۂ الفت نہیں
پاک نیت ہو تو جھگڑے عشق میں پڑتے نہیں
شمع کی الفت میں پروانے کبھی لڑتے نہیں
دل ہے شیدائے چمن اس کی محبت عام ہے
شہد کی مکھی ہے یہ ہر گل سے اس کو کام ہے

اس نظم کے متعلق ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کا تجزیہ ہے کہ:

''اس نظم میں معنویت بھی ہے اور فکری عنصر بھی اس نظم میں اظہار کی پختگی، لہجے کی متانت اور بیان کی جو تازہ کاری ہے وہ بے شمار شاعروں کو مدتوں مشق سخن کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتی۔''(۱)

---

(۱) جادہ ملا ص ۱۹ مقدمہ خلیق انجم۔

ملا صاحب نے اپنی شاعری کا آغاز اسی نظم سے کیا تھا۔ پہلی نظم کی یہ پختگی لائق ستائش ہے۔

**بیسوا:**

طوائف کی زبانی اس کی آپ بیتی بیان کی ہے، اس نظم کا انداز نہایت موثر حقیقت سے لبریز اور لطیف ہے بقول فراق گورکھپوری:

''عشق وحسن کی ایک سماجی ٹریجڈی پر روشنی ڈالتی ہے۔''(۱)

حال یہ ہے کہ بیسوا کو سماج بھی نہایت حقارت آمیز نظروں سے دیکھتا ہے مرد اس سے محبت کے کھیل کھیلتا ہے لیکن صحیح معنوں میں اس کا چاہنے والا نہیں ہوتا صرف اپنی ہوس کی پیاس بجھانے سے اس کو سروکار رہتا ہے۔ اس طرح وہ ہر طرح سے سراپا مظلوم ودرد ہوتی ہے۔ اس کا کوئی بھی صحیح معنوں میں قصہ مدد سننے والا نہیں ہوۃ تا بلکہ اس سے نفرت ہی کی جاتی ہے۔ اسے گری نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ شریف زادے تک اس سے اپنی پیاس بجھانے میں عار نہیں سمجھتے۔ وہ سراپا مظلوم ہزاروں مردوں کے کرتوت پر پردہ ڈالتی ان کے عیب چھپاتے ہوئے اپنی زندگی گزار دیتی لیکن دنیا میں اس کا کوئی ہمدرد نہیں۔ نفرت وحقارت اس کا مقدر ہے۔ اپنا دکھ وہ اس طرح زبان پر لاتی ہے:

مجھ کو دیکھو میں تمہارے عیب کا پردہ رہی
آبرو والے رہو و اس لئے رسوا رہی
زندگی بھر اک دل ہمدرد کی جویا رہی
جائے عبرت ہے کہ میں محفل میں تنہا ہی رہی
جزو ہوسنا کی جہاں میں او رکچھ دیکھا نہیں
سیکڑوں عشاق کوئی چاہنے والا نہیں

ایک طوائف (بیسوا) سے دادعیش پانے کے بعد اسے غلط سمجھتے ہیں اور ہر عیب اس کے سر منڈھ

---

(۱) اردو کی عشقیہ شاعری ص ۶۳ فراق گورکھپوری۔

دیتے ہیں ان گنت لوگوں کے سیاہ کارناموں کو بوجھ اٹھائے اوران کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ یہ اس کی عظمت کردار ہے اس کا شکوہ ملاحظہ کیجئے:

جب مرے حسن و جوانی سے دل ان کے بھر گئے
یا جب اپنا نام ومال وزر سب ہی کچھ ہر گئے
اپنے سارے عیب میرے ذمہ سب ہی دھر گئے
مجھ کو میرے چاہنے والے ہی رسوا کر گئے
بار عصیاں ایک عالم کا میری گردن پہ ہے
داغ یہ میرا نہیں ہے جو میرے دامن پہ ہے

یہ ہے ایک طوائف کی زندگی کا منفی پہلو۔ آگے چل کر یہی طوائف مرد سے یوں مخاطب ہوتی ہے اس کے بیان میں حقائق ہیں، وہ کہتی ہے اپنا سب کچھ لٹا دینے کے بعد بھی مجھ میں خامیوں کے ساتھ خوبیاں بھی ہیں:

مثل تیرے میں اسیر حلقہ زنجیر ہوں
عورتوں کی بے کسی کی میں بھی اک تصویر ہوں
زخم کے قابل ہوں میں شرمندہ تقصیر ہوں
مجھ سے یوں نفرت نہ کر میں بھی تری ہمشیر ہوں
گوہر انسانیت کے کچھ نشاں مجھ میں بھی ہیں
عیب ہیں مجھ میں جہاں کچھ خوبیاں مجھ میں بھی ہیں

ایک طوائف کی یہ داستان حیات سو فیصدی حقائق پر مبنی ہے۔ یہ سماجی المیہ بھی ہے اور عبرتناک بھی، اسی نظم میں ملا کی بلند تخیل، فکری گہرائی باریک بینی جزورسی وغیرہ کی کارفرمائیاں لائق ستائش ہیں۔

سماج کا شکار: مرزا شوق لکھنوی نے عشقیہ قصوں کو مثنویوں کی شکل دے کر بیان کرنے کی شروعات کی۔ اسی طرح یہ نظم بھی ملا نے اسی پیرائے میں تحریر کی ہے اس میں مرزا عشق کی زہر عشق سے ملتی جلتی ایک

کہانی ہے، جس کو ملا نے نظم کا روپ دیا ہے۔ نظم کا قصہ کچھ اس طرح ہے: ''ایک امیر کی لڑکی کی ایک مزدور کے لڑکے سے محبت ہوگئی۔ لڑکا صبح و شام اسی امیر زدے کے گھر کے چکر لگایا کرتا اور لڑکی کے دروازے پیپل کے پیڑ کے سائے میں بیٹھا غمگین سا نظر آتا تھا۔ لوگ اسے دیکھتے، آوازے کستے، جملے چست کرتے مگر وہ ان سب سے بے پروا اپنی دھن میں رہتا۔ ایک روز اس لڑکی کی سالگرہ تھی، لڑکے کو معلوم نہیں کیسے خبر ہوگئی، لڑکی مندر پوجا کی غرض جا رہی تھی اثنائے راہ لڑکے نے اسے ایک پھول مالا بھینٹ کی، جسے لڑکی نے سماج کے ڈر سے قبول نہیں کیا شدہ شدہ یہ خبر لڑکی کے باپ کو ہوگئی اس نے لڑکے کو بلا کر بہت سخت و ترش کہا۔ لڑکا خاموشی سے یہ سب برداشت کر کے چلا گیا، دو دن بعد اسی مہاجن زادی نے اپنی سہیلی سے لڑکے کے بارے میں پتہ لگانے کو کہا۔

جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں
اک سال سے ہر روز وہ مزدور کا بیٹا
آتا تھا ادھر شام ہو دن ہو کہ سویرا
دو روز سے لیکن اسے میں نے نہیں دیکھا
معلوم نہیں اس کو یکایک یہ ہوا کیا

بہرحال جو کچھ بھی ہوا، سب سماج کی بندشوں کی بنا پر ہی ہوا۔ آزاد ہو کر بھی انسان سماج کا تابع ہے۔ ایسی خونخوار حالت کی ترجمانی ملاحظہ کیجئے، لڑکی سوچتی ہے:

کیا دے گئی دھوکا اسے سچ مچ یہ رکھائی
نادان تھا کیسا کہ نہ سمجھا مرے جی کی
یہ شرم بھی جھوٹی ہے یہ تہذیب بھی جھوٹی
اے کاش کہ ہوتی نہ مہاجن کی میں بیٹی
چنگل میں دبائے ہے یہ خونخوار سماج آہ

قیدی ہے بشر او رہے دیوار سماج آہ
قربانی کی ہم بھیڑیں ہیں تلوار سماج آہ
جینے نہیں دیتا یہ مرد ار سماج آہ
جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں

بیانیہ شاعری مشکل فن ہے، لیکن ملا اس فن میں کامیاب ہیں، نظم موثر ہے اور دلوں کو چھوتی ہے۔

کافی ہاؤس: لکھنؤ حضرت گنج میں ہے، جس میں اردو ہندی کے شاعروں اور ادیبوں اخبار نویسوں اور سیاست دانوں کی بھیڑ رہتی یہ سب اپنی شامیں گزارنے کیلئے جمع ہوا کرتے تھے۔ ملا بھی اکثر اپنی شام اسی انڈیا کافی ہاؤس (لکھنؤ) میں گزارتے تھے۔ آنے والوں میں پروفیسر آل احمد سرور، علی جواد زیدی، ڈاکٹر عبدالعلیم مجاز، سید احتشام حسین، شوکت صدیقی، محمد حسن، کمال احمد صدیقی، پروفیسر ڈی پی مکرجی، نیشنل ہیرالڈ اخبار کے مدیر چیلا پتی راؤ ہندی کے مشہور ادیب اور بعض دوسرے نو آموز ادیب وشاعر ہر نوع کے ادبی، سماجی وسیاسی موضوعات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ بقول جواد زیدی:

''ادبی مباحث میں کبھی فلسفیانہ اور منطقیانہ اصرار اور کبھی مہذب اند اختگی اور کبھی صدق دل سے غلط کو غلط کہنے کا مخصوص انداز اور کبھی آ بگینوں کو ٹھیس لگ جانے کے ڈر سے کہنے والی بات کو بھی نہ کہنے کی ادا کر دیتی تھی۔ وہ دوسرے نقطہ نگاہ رکھنے والوں سے دبتے اور جھجھکتے نہیں تھے مگر ان کے احساسات کا پورا خیال رکھتے تھے یہاں آ کر ملا کی خاموشی کا راز کھلا معلوم ہوا کہ وہ اگر چہ ''لے دنغمہ کو اندوہ ربا'' کہتے لیکن ''اگلے وقتوں کے لوگ'' نہیں ہیں۔ اس دعویٰ کا سب سے بڑا ثبوت ملا کی نظم ٹھنڈی کافی ہے۔''(۱)

ملا کی یہ نظم ان کی دوسری نظموں پر فوقیت رکھتی ہے اور ایسی ادبی اہمیت کی حامل ہے کہ اسے جب بھی اردو کا انتخاب ہوگا بغیر اس نظم کی شمولیت کے انتخاب مکمل نہیں ہوگا۔ مختصر افسانے کے عناصر کے لحاظ سے یہ ایک افسانوی نظم ہے، جسے ملا صاحب نے افسانوی ٹچ دیتے ہوئے لائق ستائش ڈھنگ سے تحریر کیا ہے۔

---

(۱) آپ سے بھی پہلے ملے ص ۶۴ علی جواد زیدی۔

ملا نے اپنے ذاتی تجربے کو ایک رومانی حقیقت کی شکل دے کر نظم کو دلکش اور معنیٰ خیز بنا دیا ہے۔ ٹھنڈی کافی کا مفہوم عہد قدیم کی اس سرد مہری سے لیا گیا ہے، جب عاشق و محبوب سماج کے ڈر سے باوجود اس کے ان کی محبت اپنے عروج پر ہوتی تھی اپنی زبان نہیں ہلا سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ ہمت ایک عظیم گھٹن کے ساتھ سرد خانے میں چلی جاتی تھی لیکن دل ہی دل میں دونوں آتش شوق میں سلگتے رہتے تھے۔

ٹھنڈی کافی میں ۳۷ بند ہیں نظم کا قصہ یہ ہے کہ شاعر ایک مدت سے اپنے معشوق کی محبت میں سرشار تھا لیکن سماج کے خوف سے بات چیت کی نوبت نہ آسکی اور یہ اس خیال کا شکار ہو گیا کہ کہیں اس کا معشوق اسے کمتر تو نہیں گردانتا ہے۔ رفتہ رفتہ دوریاں بڑھتی گئیں اگر حسن اتفاق سے کہیں ملاقات بھی ہو جاتی تو تبسم زیرلب یا رسمی سلام سے آگے بات نہ بڑھ پاتی۔ ایک روز شاعر اپنے کسی دوست کو رخصت کرنے ریلوے اسٹیشن گیا ہوا تھا جب وہ اسے رخصت کر کے واپس آیا تو اچانک قریب کے زینوں پر ایک لمبے عرصے بعد اس کی معشوقہ نظر آئی شاعر نے بڑی ہمت کر کے اسے سلام کیا اور حال پوچھا:

دیکھ کر مجھ کو وہ ایک بار ہوئی حیراں سی
رخ پہ پھر ایک تبسم کی کرن دوڑ گئی
اک کرن جو نہیں معلوم کہاں سے پھوٹی
آج تک جس کی حقیقت کبھی مجھ پر نہ کھلی
اس کی آنکھوں کی کہ ہونٹوں کے مضافات کی تھی

اس کے بعد وہ ایک تانگے سے ایک ہوٹل کی طرف چل دی جہاں اس نے پہلے سے کمرہ بک کرا رکھا تھا۔ تاریک رات، سنسان راستہ بازار بند پورا شہر ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی دلہن تھک کر سو گئی ہو:

بند بازار تھے سڑکوں پہ تھی بجلی کی قطار
تھک کے سوئی تھی دلہن شہر کے پہنے ہوئے ہار
دھندلے دھندلے سے مکانات کہ سینے کا ابھار

ہلکی ہلکی سی ہوا سانس کی جیسے رفتار

عصمت شہر پہ چادر سی پڑی رات کی تھی

شاعر کی معشوقہ نے ہوٹل پہونچ کر اپنے کمرے کو کھولا اور اندر چلی گئی۔ شاعر نے اس سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی تو معشوقہ نے شاعر کو ضد کر کے روک لیا یہ منظر دیکھئے:

میں نے یہ کہہ کر کہ ناوقت ہے رخصت مانگی

بولی ٹھہرو ابھی جاتے ہو کہاں بیٹھو بھی

میرے تھرماس میں تھوڑی سی ہے ٹھنڈی کافی

آؤ پی لو میری خاطر سے سہی اک پیالی

ہر ادا صبر شکن اس کے مدارات کی تھی

پھر راز و نیاز کی باتیں ہونے لگیں، اور آگے یہ بند دیکھئے ان میں ملا کی فنی مہارت اور سلیقۂ تحریر اپنے عروج پر ہے انداز بیان نہایت مہذب اور شائستہ ہے:

وقت کی بات تھی یا سوز جگر کی تاثیر

وہ بھی کرنے لگی کچھ کھوئی ہوئی سی تقریر

کھینچ گئی جیسے یکایک کوئی سینے کی لکیر

گو ابھی لب پہ نہ تھی جذبہ دل کی تعبیر

ایک دنیا مری آنکھوں میں مدارات کی تھی

ہوگئی دونوں میں پھر ایک خموشی طاری

اب وہ باتوں میں روانی تھی نہ شوخی نہ ہنسی

جیسے لوہے کی سلاخوں میں گھرے دو قیدی

دور ہی دور سے کچھ آنکھوں میں کہہ لیں دو گھڑی

پا بہ زنجیر اسیروں کی ملاقات کی تھی

اور آخر میں سماج کی خود ساختہ روایات سب ڈھہ گئیں یہ رات بھی عجیب رات تھی:

ٹوٹے بوسیدہ تمدن کے کگارے آخر

رہ گئے طاق پہ دنیا کے اجارے آخر

قد آدم اٹھے سینوں کے شرارے آخر

ایک آواز میں دو جسم پکارے آخر

گفتگو حسن و محبت میں مساوات کی تھی

عظمت فطرت انساں کا لگا کر نعرہ

فاتح عشق نے مستانہ پھر اک رقص کیا

پھر فرشتوں نے حسد سے سوئے دنیا دیکھا

خلد نے خلد کے بانی کو کیا پھر سجدا

عرش پر بات پھر آدم کی فتوحات کی تھی

پروفیسر آل احمد سرور اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس نظم میں ہمیں محبت کی وہ فضا ملتی ہے، جو اس دنیا کی ہوتے ہوئے بھی آسمانوں کی ہمراز ہے۔ اس کا فطری بہاؤ اور ارتقا اور اس کی موزوں و متناسب تصویریں اس کے نفسیاتی لمحے اور شوخ اشارے اسے کامیاب محبت کا ایک دلکش ڈرامہ بنا دیتے ہیں اس نظم کی فضا میں دو کردار ابھرتے ہیں اور دونوں جادو کے کرشمے نہیں اس دنیا کے انسان ہیں جو مل بیٹھتے ہیں تو دنیا کچھ اور حسین اور گوارا ہو جاتی ہے، جو ذہنی پرچھائیاں نہیں گوشت پوست کے انسان ہیں یہ نظم جدید بھی ہے اور لذیذ بھی۔''(۱)

اس نظم کے ذریعے ملا صاحب نے مذہبی سماجی تمدنی اور اقدار کی بندشوں کے خلاف صدائے احتجاج

(۱) جوئے شیر ص ۲۲ مقدمہ آل احمد سرور۔

بلند کی ہے۔ ہر بند اپنے اندر معنویت اور اچھوتا پن رکھتا ہے نظم میں رعنائی ورنگینی، لوچ و بانکپن آہنگ و ترنم اور حسن موسیقی کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

''اس نظم میں وہ جدید انداز بیان اور جدید طرز ادائی ایمائیت اور نئے فنکارانہ شعور سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔''(۱)

مریم ثانی: پچھلے شاعروں کے یہاں عشق کا روحانی تصور ہوا کرتا تھا۔ اس کے برخلاف ملا جسمانی اتصال کے قایل ہیں اس لئے کہ وہ جنس Sex کو عین فطرت سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں روحانیت کا کوئی تصور نہیں ہے، اظہار حسن کے سلسلے میں ملا کے یہاں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے ان کی نگاہ میں روحانی حیثیت ایک طرح کا فریب اور مکر ہے، بقول علی جواد زیدی:

''ملا کی جتنی روحانی نظمیں ہیں ان میں سوسائٹی کی خامیوں اور سماج کی کمزوریوں کی طرف خاص طور پر نشاندہی ملتی ہے اسی لئے مریم ثانی جیسی خوبصورت متحرک نرم اور گلگوں نظم میں بھی ان کا ذاتی اور انفرادی غم معاشرے کی عام غم انگیز فضا کا ایک اٹوٹ حصہ بن جاتا ہے۔''(۲)

نظم مریم ثانی محبوبہ کے ایک خط کے جواب سے شروع ہوتی ہے نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ شاعر کی محبوبہ کبھی ماضی میں اسے ٹھکرا چکی ہے اور شاعر سے طویل خاموشی کا سبب پوچھتی ہے اس سوال نے شاعر کی یادوں کے سارے چراغ یک دم سے روشن کر دیے اور اسے عہد تمنا کی ساری باتیں یاد آ گئیں۔ ماضی کی حسرت رہگذار دل آزار تصویر گزرے ہوئے دنوں کی یاد یک دم تازہ کر دیتی ہے، ملا نے اسے بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے:

تم کرو میری خموشی کا گلہ
تم نے سوچا کبھی وجہ خموشی کیا ہے
جس کی نظروں سے جل اٹھتے تھے شبستاں کے چراغ

---

(۱) جدید شاعری ص ۳۱۴ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔
(۲) سیاہی کی ایک بوند ص علی جواد زیدی۔

جس کے نغموں سے ہر اک ساز پہ جان آتی تھی

اور مرے ماضی رنگیں کی درخشاں تصویر

یک بیک جھاڑ کے گذرے ہوئے ایام کی گرد

آ گئی پیش نظر

جیسے کہرے کی سیاہی کی تہوں سے ابھرے

کانپتی اور ٹھٹھرتی ہوئی دھندلی دھندلی

پوس کی چاندنی رات

شاعر کا ظاہری اور بدنی عشق ملاحظہ کیجئے:

جب محبتیں اپنی ہر اک سانس پہ شامل پا کر

میں نے محسوس کیا تم سے محبت ہے مجھے

مجھ کو معلوم نہیں عشق کسے کہتے ہیں

مگر اک زیست کے ہر خواب تمنا کی اگر

کسی اک آنکھ سے تعبیر کا خواہاں ہونا

اپنے ہر شوق کے افسانہ رنگیں کی اگر

کسی اک نام سے زیبائش عنوان ہونا

اور اک جسم کے بے چین تقاضوں کے لئے

کسی آغوش کی نرمی میں تسلی کی تلاش

یہ محبت ہے تو کی میں نے محبت تم سے

شاعر کے جب اس طرح کے عشق کو محبوبہ نے بوالہوسی ٹھہرایا، تو شاعر نے اس رومان اور حقیقت کو

ایک نئے اور دلچسپ انداز میں یوں پیش کیا ہے:

ہاں مجھے ناز ہے اس پر کہ ہوس مند ہوں میں
تم نہ مانو کہ ہے حوا کا لہو تم میں رواں
مجھ کو تسلیم کہ آدم کا جگر بند ہوں میں

اس جواب کے باوجود محبوبہ نے ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے مذہبی اخلاقی اور سماجی اصولوں کو ہر ممکن طرح سے سمجھانے کی کوشش کی اور اس کے بعد پھر وہی باطنی اور حقیقی محبت کا ترانہ چھیڑ دیا اور شاعر کے جذبہ عشق کو جسم کا آزار قرار دیا۔

روح کی پاک محبت کا فسانہ چھیڑا
عشق معصوم کی عظمت کے ترانے گائے
اور الفت کو میرے جسم کا آزاد کہا

ایسے دل میں جب کسی طرح کے شوق کی بے تابی ہو تو وہ محبوبہ اس زمانے کی مریم ثانی ہی کہی جا سکتی ہے، جس کے جسم میں خون کی جگہ گنگا جل بھرا ہو اس کا دل کیلاش پربت پر جمے ہوئے برف کی طرح ٹھنڈا ہو، ایسی محبوبہ اس دھرتی کی باسی نہیں بلکہ آسمانی دنیا کی کوئی روح ہو سکتی ہے:

اور اب تم کو محبت کی ضرورت کیا ہے
تم تو موجوں سے نظر پھیر چکی ہو تو تمہیں
کسی طوفاں کے نظارے کی تمنا کیوں ہے
جب کہ پہلو میں دبائے ہو تم اک دل کی جگہ
کسی کیلاش پر صدیوں کا جما پارہ برف
کیوں کسی لہر کی کرنوں سے حرارت مانگو
جب عوض خوں کے رگوں میں ہے رواں گنگا جل

آرتی کیوں کسی آلودہ نظر سے چاہو
تم تو روحوں کی فضاؤں میں ہو اڑنے والی
مجھ سے اک خاک نشیں سے تمہیں نسبت کیا ہے
تم ہو اس دور کی مریم ثانی تو تمہیں
اک گنہگار کے سجدوں کی ضرورت کیا ہے
دل تمہیں دے بھی چکا تم اسے ٹھکرا بھی چکیں
اب تمہیں میری خموشی سے شکایت کیا ہے

نظم ''ٹھنڈی کافی'' کی طرح یہ نظم بھی بہت کامیاب ہے، ہاں اس میں جوش کی کمی ہے، لیکن تخیل کی بلند پروازی کے ساتھ ملا سماجی کمزوریوں کو فلسفیانہ روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں اس وجہ سے نظم وقیع ہو جاتی ہے اس میں سماج کے تمام کہنہ اور فرسودہ نظام رسم ورواج دھرم اور اخلاق کے خودساختہ ضابطوں کو خاص طور سے طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے، جس کی وجہ سے انسانیت بے حس و بے مروت ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے جذبات کا کوئی قدرداں نہیں۔ سماج کے افراد پر ظلم اور استحصال صدیوں سے جاری ہے اس لئے شاعر نے سماجی تبدیلیوں کی خواہش کے ساتھ اس کے بناوٹی نظام پر زبردست چوٹ کی ہے۔ انہیں تمام اوصاف و وجوہات کی وجہ سے ملا کی یہ نظم بڑی اہمیت اور افادیت رکھتی ہے۔ ملا کا سماجی مشاہدہ تفکر بہت وسیع اور گہرا ہے۔

سیاہی کی ایک بوند میں سنسکرت سے ماخوذ ملا کی چند نظمیں ہیں، جنہیں بالواسطہ انہوں نے انگریزی سے نظم کیا ہے، ملا سنسکرت سے ناواقف تھے پھر بھی انہوں نے ان نظموں میں اصلی پن Originality اور حقیقت کا شک ہوتا ہے، مثلاً ہندوستانی عورت کے جذبات کی مرقع کشی ملاحظہ کیجئے:

میرے من میرا پریتم
سوتا ہے اک کچی نیند
دھیمے بولو جاگ نہ جائے اور سن لے

ملا صاحب کی سبھی قومی، وطنی، سیاسی، شخصی، رومانی اور مسلک انسانی کی نظموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا سماجی اور اجتماعی مشاہدہ نہایت بلند تھا۔ ملا کی تمام تر شاعری میں حب الوطنی، قوم پرستی، اخلاق اور ایک آدرش مشرب اور عقیدہ ہے، مجموعی طور سے اردو نظم کے ارتقائی سفر میں نظیرا کبرآبادی، حالی اور چکبست کے بعد ملا ہی اس فہرست کے پانچویں لائق ذکر شاعر ہیں۔

باب پنجم

# دیگر اصنافِ سخن کا مطالعہ

# ملا کے قطعات کا تنقیدی مطالعہ

غزل اور نظم کی طرح ملا نے اپنے قطعات میں بھی انسانی کرب امن عالم اخوت اور متنوع موضوعات کو شامل کر کے انہیں آفاقیت عطا کی ہے۔ ان کی تمام تر نگارشات انسان دوستی کے پیغام سے مملو ہیں۔ ذیل کے قطعات میں انہوں نے فلسفہ ارتقا اور دنیا کی اضطرابی کیفیت کو جس خوش اسلوبی کے ساتھ نظم کیا ہے وہ قابل توجہ ہے۔ جادۂ ملا میں ان کے نو قطعات شامل ہیں، جن کو انہوں نے مختلف عنوانات دیکر پیش کیا ہے، ملاحظہ کیجئے:

**درد زیست:**

زیست اک کوہ گراں ہے وہ یہاں ہو کہ وہاں
درد ہی نغمۂ جاں ہے وہ یہاں ہو کہ وہاں
آج بھی ہر افق صبح کو کجلائے ہوئے
شب ہستی کا دھواں ہے وہ یہاں ہو کہ وہاں

**نوروظلمت:**

نوروظلمت نے اس طرح مل کر
دائرے دائروں میں ڈالے ہیں

آج آسان نہیں ہے یہ کہنا
یہ اندھیرے ہیں وہ اجالے ہیں

## کانٹوں کی بہار

اگ رہے ہیں چمن میں یوں کانٹے
گل کا کوسوں تلک نشاں ہی نہیں
آشیانہ تو کب کا جل بھی چکا
دل میں اب خواب آشیاں بھی نہیں

## اضطراب دنیا:

کوئی کروٹ بڑی سی لینے پھر
مضطرب بار بار ہے دنیا
جیسے اگر مرگ ناگہاں کیلئے
ہمہ تن بے قرار ہے دنیا

## انتقام

شیخ صاحب کی تلخ گوئی نے
اور الٹا ہی کچھ اثر ڈالا
جانے کتنوں نے سن کے وعظ ان کا
انتقاماً گناہ کر ڈالا

## حسن کی پوشاک:

اس حسن خدادا کو کچھ اور سنوارا
ترشے ہوئے الماس کے ہر رخ کو ابھارا

گل ہے تہ شبنم کہ ہے صہبا پس مینا
پوشاک کی پوشاک نظارے کا نظارا

**جبر پشیماں:**

میرے چہرے کا رنگ یوں زرد ہے کیوں
میرے ہونٹوں پہ دم سرد ہے کیوں
میں نے ہی تو دشمن کو کیا تھا خود قتل
پھر آج یہ پہلو میں مرے درد ہے کیوں

**انفرادیت:**

اپنی باتیں بھی مجھ کو کرلینے دو
دنیا سے الگ اک آہ بھر لینے دو
یارو نہ سکھاؤ مجھ کو جینے کے طریق
مجھ کو اپنی ہی طرح مرلینے دو

**بڑھاپا:**

اب کوئی گیت سناتے ہیں گذرتے ہوئے دن
نہ کوئی درد جگاتے ہیں گذرتے ہوئے دن
دل سے چپ چاپ دبے پاؤں گذر جاتے ہیں
جیسے اب آنکھ چراتے ہیں گذرتے ہوئے دن

(بحوالہ جادۂ ملا)

**منزل:**

گذرے ظلمات جہاں سے بہ سلامت ملا
ڈر رہے تھے نہ گذر پائیں گے بارے گذرے

کچھ تو راہیں تری نظروں نے فروزاں کر دیں
کچھ سے ہم اپنے ہی اشکوں کے سہارے گذرے

(بحوالہ سیاہی کی ایک بوند)

مندرجہ قطعات کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی بھی خیال یا جذبے کو قطعہ کی شکل میں پیش کرنے کی انہیں بہترین صلاحیت حاصل ہے، ذیل کے قطعہ میں انہوں نے شعر کی ماہیئت پر روشنی ڈالی ہے۔ان کا خیال اس ضمن میں جوش کے خیال سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ بہرحال اسے محض خیال یا تفکر ہی کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ زبان شاعر جذبات شاعری کی ترجمانی کرتے ہوئے صرف اشاروں یا کنایوں سے کام لیتی ہے تفصیلی گفتگو نہیں ہوا کرتی۔ یہی کسی شعر کا حسن ہے کہ قاری مقصد شاعر تک پہنچنے کیلئے ان میں نزاکتوں اور گوشوں کو تلاش کرنے کی فکر کرے جو شاعر کہہ گیا ہے،ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی شعر کی ماہیئت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شاعر کا حساس دل مجاز وحقیقت میں ایک ربط پیدا کرتا ہے۔ دراصل مجاز ایک آئینہ ہے، جس میں روئے حقیقت نظر آتا ہے یہ شاعر کے کمال کی دلیل ہے کہ اس مجازی آئینہ میں وہ روئے حقیقت دیکھتا ہے اس کے علاوہ رواں کے بند میں ایک خاص بات اور واضح کی گئی ہے، کہ شاعر کا دل جو محسوس کرتا ہے یا اس کے ذہن میں جو خیالات ابھرتے ہیں ان کا عشر عشیر وہ صفحہ قرطاس پر نہیں منتقل کرتا ہے بلکہ کچھ عمداً چھوڑ دیتا ہے اور محض چند اجمالی اشارات کے ذریعے اپنے خیالات ومحسوسات وضع کرتا ہے اس کے دل میں جذبات کے جو آتش فشاں پھوٹتے ہیں ان کے بیان کیلئے نطق کافی نہیں ہے، رواں کا بند ہے:

اسی تصویر کا اک رخ ہے یہ دنیائے لطیف
ناظم کون ومکاں ہے یہ ہے اس کی تعریف
ہے زباں اس کے ادا کرنے کو اک جز وضعیف
منبر بارگہ خاص ہے یہ فن شریف

پردہ اسرارمجازی سے اٹھانے والا

آئینہ روئے حقیقت کو دکھانے والا(۱)

اسی خیال کو حضرت جوش ملیح آبادی نے اپنی نظم ''نقاد'' میں اس طرح ظاہر کیا ہے:

دل میں جب اشعار کی ہوتی ہے بارش بے شمار

نطق پر بوندیں ٹپک پڑتی ہیں کچھ بے شمار(۲)

جذبات وخیالات کی بے شمار بارش جو قلب شاعر پر ہوتی ہے اس کی چند بوندیں بشکل شعر (الفاظ) صفحہ قرطاس پر ٹپک جاتی ہیں لیکن اس بارش کا بیشتر حصہ دل شاعر ہی میں رہ جاتا ہے اسی نظم میں آگے کہتے ہیں:

مر کے بھی تو شاعری کا بھید پا سکتا نہیں

عقل میں یہ مسئلہ نازک ہے آ سکتا نہیں

تو سمجھتا تھا جو کہنا چاہتا تھا کہہ گیا

پوچھ شاعر سے کہ وہ کیا کہہ گیا کیا رہ گیا

لیکن دنیا سمجھتی ہے کہ شاعر نے جو کچھ محسوس کیا تھا وہ سارا بیان کر دیا ہے، حالانکہ فی الحقیقت ایسا نہیں ہے، اسی خیال کو ملا نے اپنے محسوسات کو اس طرح شعری پیکر عطا کیا ہے، درج ذیل قطعہ، جس کی طرف اشارہ پچھلی سطور میں کیا گیا ہے، ملاحظہ کیجئے:

کھینچتی ہے زندگی احساس شاعر پر نقوش

پھوٹتی ہے جن سے کرنیں ذہن ودل پر پے بہ پے

نطق اڑا لیتا ہے ان کرنوں کا اک ہلکا سا عکس

اور انہیں پرچھائیوں کا نام ملا شعر ہے

---

(۱) جگت موہن لال رواں حیات اور ادبی خدمات ص ۲۰۹ ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۴ء۔

(۲) انتخاب کلام جوش ص ۱۳۲ احتشام حسین ومسیح الزماں کتاب محل الہ آباد۔

عزیزلکھنوی نے رباعی کی ایجاد پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، روح رواں کے دیباچے میں ان کے دومتضاد بیانات ہیں، جوایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں اس لئے ان کی تحقیق بھی ادھوری رہ جاتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''رباعی ۲۵۱ میں یعقوب بن لیث بن صفار کے عہد میں ایجاد ہوئی اور رودکی کے سراس اختراع کا سہرا ہے۔''

لیکن اسی دیباچے میں عزیزلکھنوی لکھتے ہیں:

''قدماکے بعض تذکروں سے رباعی کا وجود یعقوب سے بھی قبل معلوم ہوتا ہے۔''(۱)

عزیزلکھنوی کی ان متضاد بیانات کے سلسلے میں ڈاکٹرظفرعمرقدوائی نے بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''دراصل رودکی دولت صفاریہ کا شاعرنہیں بلکہ نصربن احمد سامانی جو ۲۹۵ھ میں تخت نشین ہوا، اس کے دربار کا ملک الشعراء تھااس نے ۳۰۴ھ میں وفات پائی۔عزیزلکھنوی نے غلطی سے اسے دولت صفاریہ کا شاعرلکھ دیا ہے۔رودکی کا پورا نام محمد جعفر ہے یہ رودک نامی گاؤں میں پیدا ہوا، اس کی رعایت سے اسے رودکی کہا جاتا ہے۔رودکی بھی انگریزی شاعر ہومر کی طرح مادرزاداندھا تھا، آٹھ سال کی عمر میں اس نے قرآن حفظ کیا، اوراسی عمر سے شاعری کی ابتدا کی۔اس کے علاوہ شاعری سے متعلق تمام علوم وفنون کی واقفیت بہم پہونچائی۔عزیز نے اسی دیباچے میں بایزید بسطامی المتوفی ۲۲۴ھ کی دو رباعیات بھی ثبوت کے طور پر پیش کی ہیں۔

اے عشق تو عارف عامی را
دسودائے تو گم کردہ نکو نامی را
ذوق طلب میگوں تو آورد بروں

---

(۱) دیباچہ روح رواں جگت موہن لال رواں اردو اکیڈمی لکھنؤ دوسرا ایڈیشن۔

از صومعہ بایزید بسطامی را
مارا ہمہ بہ کوئے بدنامی دارد
وزسوختگاں نصیب ما خامی دارد
ناکامی ماہست کام دل دوست
کام دل ما ہمیشہ ناکامی دارد (۱)

عزیز لکھنوی کے ان متضاد بیانوں کی روشنی میں ڈاکٹر سلام سندیلوی بھی یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ عزیز لکھنوی کا بیان معتبر نہیں، غلط فہمی پر مبنی ہے، ملاحظہ کیجئے:

''مولانا عزیز نے بھی رودکی کو عہد صفاریہ کا شاعر غلط فہمی کی بنا پر لکھ دیا ہے، اور ۲۵۱ھ سال ایجاد رباعی غالباً قدر بلگرامی کی کتاب قواعد العروض یا احسن مارہروی کے کلیات ولی سے اخذ کیا ہے، اس لئے عزیز کا کوئی بیان اہمیت نہیں رکھتا ہے۔'' (۲)

رباعی کی ایجاد کے بارے میں مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''شاعری کے متعلق اس خاندان کا بڑا احسان یہ ہے کہ رباعی کی ایجاد اسی زمانے میں ہوئی۔ یعقوب صفار کا ایک کمسن بچہ ایک دن اخروٹوں سے کھیل رہا تھا ایک اخروٹ لڑھکتے لڑھکتے ایک گڈھے میں جا گرا بچہ کی زبان سے بے ساختہ یہ مصرعہ کلا: ع۔''غلطاں غلطاں ہمی رود تالب گو'' یعقوب بھی موجود تھا اس کو بچے کی زبان سے یہ موزوں کلام پسند آیا لیکن چونکہ اس وقت تک اس بحر میں اشعار نہیں کہے جاتے تھے تو شعراء کو بلا کر ان سے کہا یہ کون سی بحر ہے، انہوں نے کہا ہزج ہے پھر تین مصرعہ لگا کر رباعی کر دیا، مدت تک یہی نام رہا پر دوبیتی کے بجائے رباعی کہنے لگے۔'' (۳)

شبلی کی روایت سے بھی یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ یہ واقعہ کس سنہ کا ہے، بہر حال ابھی تک سال

---

(۱) جگت موہن لال رواں حیات اور ادبی خدمات ص ۱۱۸ ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۴ء۔
(۲) اردو رباعیات ڈاکٹر سلام سندیلوی ص ۵۹ نسیم بکڈپو لکھنؤ۔
(۳) شعر العجم جلد اول ص ۲۰ شبلی نعمانی دار المصنفین اعظم گڑھ۔

ایجاد رباعی کا تعین نہیں ہوسکا ہے صرف اسی قدر مصدقہ ہے کہ دولت صفاریہ میں اس کا نام بجائے رباعی کے دوبیتی تھا مگر رباعی کے مقابلے میں دوبیتی کو شہرت نہ ملی اور رباعی رباعی کہلائی۔

علی جوادزیدی نے رباعی کی ابتدا کے بارے میں دوروایت نقل کی ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''المعجم کی روایت ہے کہ عید کے دن رودکی نے چندلڑکوں کو سرراہ جوز بازی کرتے دیکھا، ایک خوبصورت لڑکے نے سب جوزیں گچی میں ڈال دیں ایک جوبچ رہی تھی وہ بھی لڑھکتی ہوئی گچی کی طرف چلی، حسین لڑکا خوشی سے بول اٹھا: ع -غلطاں غلطاں میں ہمیں رودسرگو' رودکی کو یہ وزن پسند آیا اور اسی وزن میں تین اور مصرعے لگا کر رباعی پوری کردی اور پھر دوسرے شعراء نے بھی اسی کو اختیار کیا۔ اس کے برعکس دولت شاہ سمرقندی کی روایت کے مطابق امیر یعقوب بن لیث بن صفاریہ (م ۲۶۵) کے بچے کی زبان پر جوز کھیلتے وقت یہ مصرعہ جوش مسرت میں رواں ہوگیا تھا: ع -غلطاں غلطاں ہمیں رودتالب گو' امیر یہ سن کر بہت خوش ہوا اور اس نے فوراً دوشاعروں ابودلف عجلی اور ابن الکعب کو اس کی تقطیع کا حکم دیا، انہوں نے اسے بحر ہزج کی شاخ بتایا اور اسی وقت تین ہم وزن مصرعے نظم کئے اور رباعی پوری کردی۔ (۱)

تھوڑا سا جزوی اختلاف دونوں روایت میں ضرور ہے لیکن اتنا مصدقہ ہے کہ شروع میں دوبیتوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے دوبیتی کہلائی بعد میں اسے رباعی کہنے لگے، عروضیوں نے رباعی کے چوبیس اوزان مقرر کئے ہیں، یہ سبھی بحر ہزج میں ہیں، اس کی دوشاخیں ہیں، بحر ہزج اخرم، بحر ہزج اخرب جیسے:

دائرہ اخرم:-

۱-مفعولن مفعولن مفعولن فاع

۲-مفعولن مفعولن مفعولن فع

۳-مفعولن مفعولن مفعولن فعولن

۴-مفعولن مفعولن مفعولن فعل

---

(۱) رباعیات انیس ص ۲۶ علی جوادزیدی قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو نئی دہلی دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۸ء۔

۵-مفعولن مفعولن مفاعیلن فاع

۶-مفعولن مفعول مفعو عیلن فع

۷-مفعولن مفعول مفاعیل فعول

۸-مفعولن مفعول مفاعل فعل

۹-مفعولن فاعلن مفاعلن فاع

۱۰-مفعولن فاعلن مفاعلن فع

۱۱-مفعولن فاعلن مفاعیل فعول

۱۲-مفعولن فاعلن مفاعیلن فعل

دائرہ ہزج اخرب:-

۱-مفعول مفاعیلن مفعول فعول

۲-مفعول مفاعیلن مفعول فعل

۳-مفعول مفاعیلن مفعولن فاع

۴-مفعول مفاعیلن مفعول فع

۵-مفعول مفاعلن مفاعیل فعول

۶-مفعول مفاعلن مفاعیل فعل

۷-مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع

۸-مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع

۹-مفعول مفاعیلن مفاعیلن فاع

۱۰-مفعول مفاعیل مفاعیل مفعول

۱۱-مفعول مفاعیل مفاعیل فعل

۱۲-مفعول مفاعیل مفاعیل فع

شجرۂ اخرم کے مقابلے میں شجرۂ اخرب کے اوزان ہلکے ہیں اس لئے اردو فارسی میں یہ زیادہ مقبول ہیں۔

رباعی سے ملتی جلتی چار مصرعوں والی شاعری دنیا کے دوسرے ادبوں میں بھی پائی جاتی ہے، اور ہر زبان میں اسے شرف قبولیت بھی حاصل ہوا ہے، ہندی میں رباعی کو مکتک یا چتش پدی کہتے ہیں ( मुक्तक या चतु पदी ) چتش پدی قطعہ بھی ہوسکتا ہے اس کے فارسی یا اردو رباعی کی طرح اوزان بھی مقرر نہیں ہیں اور نہ ہندی شعراء نے اس طرف کوئی خاص توجہ دی ہے، ملاحظہ کیجئے:

ساون میں مرو ستھل (۱) بھی چہک جاتے ہیں
کانٹے بھی بہاروں میں مہک (۲) جاتے ہیں
اس نادان جوانی پہ نہ جھنجھلاؤ تم
اس عمر میں سب لوگ بہک جاتے ہیں

............☆☆☆............

کفن بڑھا تو کس لئے کہ آنکھ ڈبڈبا گئی
سنگار کیوں سہم گیا بہار کیوں لجا گئی (۳)
نہ جنم (۴) کچھ نہ مرتو (۵) کچھ بس اتنی صرف بات ہے
کسی کی آنکھ کھل گئی کسی کو نیند آ گئی

**(نیرج)**

ان دونوں ہندی رباعیوں کے اوزان میں کس قدر فرق ہے۔ اہل علم حضرات خود مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ سنسکرت میں اسی طرز شاعری کو چار چرن، مکتک اور چتش پدی کہا جاتا ہے، سنسکرت کے تمام اشلوک

---

(۱) ریگستان (۲) خوشبو دینا (۳) شرما جانا (۴) ولادت (۵) موت

اسی صنف شاعری میں موجود ہیں یہ چار مصرعوں کی شاعری ہندی مکتک چتش پدی کی طرح اوزان کی قید سے بے نیاز ہوتی ہے بات صرف یہ ہے کہ اس کے چاروں مصرعے ہم قافیہ یا دو ہم قافیہ یا سب الگ الگ قوافی کے ہو سکتے ہیں، ملاحظہ کیجئے:

दिन मीप रजनी सांय प्रातः
शिशिर बसन्तौ पुनरायातः
कालः क्रीडति गच्छ त्यायुः
तदीप न मुन्चित अरशा बायुः

ترجمہ:- دن رات، جاڑا گرمی برسات ہر دن اور ہر موسم میں انسان موت کا رقص دیکھتا رہتا ہے، پھر بھی دنیا سے امیدیں وابستہ رکھتا ہے۔

اسی طرح انگریزی کی کواٹرن Quatern کو بھی رباعی کی صنف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ایک کواٹرن ملاحظہ کیجئے، اس میں بحر یا وزن کی پابندی نہیں برتی جاتی:

**I Strife with none, For non was worthy my strife,**

**Nature I loved, And next to nature, Art,**

**I warmed both hand before fire of life,**

**It sinks and I am ready to depart. (W.S. Landore) (1)**

اردو میں جس طرح غزل، قصیدہ، مثنوی وغیرہ فارسی سے آ کر رائج ہوئے رباعی بھی فارسی کی دین ہے۔ اردو میں رباعیاں ہر عہد میں لکھی جاتی رہی ہیں لیکن دور جدید سے قبل شعراء نے پوری دلچسپی یا لگن سے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ قدماء کے نزدیک اس کی ضرورت مرثیوں میں پیش خوانی کیلئے ہوتی تھی۔ یا ترتیب دیوان کے سلسلے میں چونکہ کسی نے رباع کو ایک مستقل صنف سمجھ کر نہیں اپنایا تھا، اس لئے ان شعراء کے کلام میں جامعیت کے فقدان کا احساس ہوتا ہے پھر بھی عہد قدیم سے لے کر دور حاضر تک مسلسل رباعیاں کہی جانے کی بنا پر اردو میں اس کے ایسے گرانقدر نمونے اکٹھا ہو گئے ہیں کہ اردو رباعی کی اہمیت

(1) Anthology of verse By Edvin J. Thompson, Page 113

سے انکار ممکن نہیں ہے۔

اردو رباعی کے قدیم ترین نمونے دکنی ہندوستان میں ملتے ہیں، تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ریاست گول کنڈہ کا مشہور حکمراں محمد قلی قطب شاہ (۱۵۶۲ء تا ۱۶۱۱ء) اردو کا پہلا رباعی گو شاعر تھا، اس سلسلے میں ڈاکٹر سلام سندیلوی رقم طراز ہیں:

''موجودہ تحقیق نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ اردو کا پہلا رباعی گو شاعر محمد قلی قطب شاہ ہے'' (۱)

بطور نمونہ محمد قلی قطب شاہ کی ایک حمدیہ رباعی ملاحظہ کیجئے:

تج حسن سے تازہ ہے سدا حسن جمال
تج یار کی بستی تے رہے عشق کو چال
تو ایک ہے تجھ سا نئیں دوجا کوئی
کیو پاوے جگت صفحے میں کوئی تیری مثال

دکن کے ایک اور مشہور شاعر ملا وجہی کی سچائی پر مبنی یہ رباعی دیکھئے:

دنیا کے سو لوگاں میں وفا دستا نئیں
دھندوے کے جفا باز دستا نئیں
بے مہری آدم ہے سن سوں اس کی
دل باندھنے میں کچھ دغا دستا نئیں

شمالی ہند کے شعرائے سلف کے سرمایہ شاعری کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان شعراء نے بھی زیادہ رباعیاں نہیں کہی ہیں۔ لیکن میر و سودا کے زمانے میں چند شعراء نے رباعیاں کہی ہیں، مگر ان کی توجہ بھی زیادہ تر دوسرے اصناف سخن ہی کی طرف مبذول رہی اور رباعی کی طرف پوری توجہ اور دل بستگی سے یہ لوگ بھی رجوع نہیں ہوئے پھر بھی اس عہد کے رباعی گو شعراء چونکہ تعداد میں زیادہ ہیں

(۱) کعبہ میں صنم خانہ ص ۲۲ ڈاکٹر سلام سندیلوی نسیم بکڈپو لکھنؤ فروری ۱۹۶۶ء۔

اس لئے یہ زمانہ رباعی کے ارتقائی دور کے لحاظ سے اہم ہے اس دور میں درد، میر، سودا، سوز، غمگین، تاباں، حسرت، قائم وغیرہ کے نام خاص ہیں اوران کی رباعیاں بھی گوناگوں محاسن کی حامل ہیں چند شعراء کی رباعیاں ملاحظہ کیجئے:

اے درد سبھوں سے برملا کہتا ہوں
توحید نہ میں چھپا چھپا کہتا ہوں
ملا کو بھی اس میں نہیں چاہے انکار
بندہ بندہ خدا خدا کہتا ہوں

(خواجہ میر درد)

پیغمبر حق کہ حق دکھایا اس کا
معراج ہے کمترین پایا اس کا
سایہ جو اسے نہ تھا یہ باعث ہے گا
کل حشر کو ہوگا سب پہ سایا اس کا

(میر تقی میر)

اے امت حضرت رسول الثقلین
مانگو ہو اگر دونوں جہاں کا تم چین
تو ورد کرو صبح ومسا اتنا تم
اللہ محمد و علی و حسنین

(میر سوز)

بارہ جو ہوئے فلک پہ یہ برج بنا
ہے بارہ امام کا مقام اعلیٰ

چودہ جو زمین و آسمان کے ہیں طبق

سو چہاردہ معصوم کی کرتے ہیں ثنا

(جعفرعلی حسرت دہلوی)

عہد مصحفی (۱۷۵۰ء تا ۱۸۲۴ء) بھی رباعیات اردو کے حق میں اچھا نہیں کہا جاسکتا صرف مصحفی کی رباعیاں تعداد اور معیار دونوں لحاظ سے اچھی ہیں اس لئے دوسروں سے صرف نظر کرتے ہوئے مصحفی کی یہ رباعی ملاحظہ کیجئے:

عینیت ذات جس کو حاصل ہووے

عین دریا ہے گو کہ ساحل ہووے

کیا دخل ہے عکس رونما ہووے اگر

آئینے کے آئینہ مقابل ہووے

(غلام ہمدانی مصحفی)

بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں جبکہ اردو شاعری کا نیر اقبال چرخ چہارم پر تھا اس وقت بھی رباعی اپنی تیرہ قسمتی کے دن کاٹ رہے تھی، اس کی وجہ اس دور کے شعراء کی عدم توجہی کہی جاسکتی ہے اس کے بعد لکھنؤ کے دبستان شاعری کے دو اہم نامور شعرا آتش وناسخ کے ہاتھوں بھی عروس رباعی اپنے گیسو پوری طرح نہ سنوار سکی، شاگردان ناسخ کی رباعیاں بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی ہیں لیکن لکھنؤ کے ہی دو نامور شعراء انیس (۱۷۹۹ء-۱۸۷۴ء) اور دبیر (۱۸۰۳ء - ۱۸۷۵ء) نے بلاشبہ نہایت اور قابل قدر رباعیاں کہی ہیں، خاص طور سے انیس نے اپنی رباعیوں میں سیدھی سادی باتیں اس تیکھے پن سے کہی ہیں کہ جو دل سے نکلتی ہیں اور دل میں اتر جاتی ہیں۔

ملا کے پہلے مجموعے جوئے شیر (مطبوعہ ۱۹۴۹ء) کی ابتداء انہوں نے اس قطعہ سے کی ہے، جس میں ان کے مقصد شاعری کا لب لباب ہے،

گرتوں کو تھامے جو وہ کف دستگیر لا
تقدیر شب میں صبح کی روشن لکیر لا
مرہم نہیں نظر میں تو نشتر زنی نہ کر
یا تیشہ لے نہ ہاتھ میں یا جوئے شیر لا

اس قطعہ کی تعریف کرتے ہوئے جعفر علی خاں اثر لکھنوی لکھتے ہیں:

''اس کی بلاغت اور معنویت کا کیا ٹھکانہ ہے، جوئے شیر کی رمزیت، درد اور مداوائے درد محنت اور صلہ محنت کی طرف اشارہ کرتی ہے ''خط ابیض'' کی قدیم اصطلاح صرف ایک محدود خیال کی حامل تھی، اس کی جگہ روشن لکیر نے (حالانکہ خط ابیض کا قریب قریب لفظی ترجمہ ہے) کیا کیا نورانیت بکھرائی ہے، اور معنیٰ میں کس قدر وسعت پیدا کی ہے اس میں تعذیر اور نوشتہ تقدیر کا مفہوم بھی سما گیا ہے کیونکہ پیشانی کی لکیریں قسمت کا لکھا سمجھی جاتی ہے (یا تھی؟) خط ابیض، سپیدۂ سحر، یا پو پھٹنا ہے اور بس۔ روشن لکیر تقدیر شب کو جگاتی اور ضمیر شب کو منور کرتی ہے تاریکی کو پیام نور اور نوید بصیرت و بصارت دیتی ہے، روشن لکیر اور جوئے شیر میں کیسا لطیف ربط، کتنی دلکش مماثلت ہے۔'' (۱)

---

(۱) اثر کے تنقیدی مضامین جعفر علی خاں اثر لکھنوی ص ۱۸۸۔

# رباعیات

ربع عربی میں چار کو کہتے ہیں چونکہ رباعی میں معینہ طور پر صرف چار مصرعے ہوتے ہیں اس لئے اسے رباعی کہا جاتا ہے رباعی کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے موضوع کی ابتدا پہلے مصرعہ سے ہوتی ہے دوسرے اور تیسرے مصرعے میں اس کی وضاحت کی جاتی ہے اور چوتھا مصرعہ حاصل کلام ہوتا ہے اسی مصرعہ کی صناعی اور بلاغت پر رباعی کی عمدگی کا دارومدار ہوتا ہے اس کیلئے بحر ہزج مختص ہے، رباعی کی ایجاد کے بارے میں ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی لکھتے ہیں:

''رباعی کی ایجاد کے بارے میں بہت سی روایات ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان روایات کی بنیاد پر رباعی کی ایجاد کا صحیح دور متعین کرنا مشکل ہے چنانچہ فارسی کی سب سے قدیم کتاب جس سے رباعی کی ایجاد کا پتہ چلتا ہے وہ المعجم فی معائر الاشعار العجم ہے، جو شمس الدین رازی کی تصنیف ہے چونکہ اس کا سال تصنیف ہی ابھی تک متعین نہیں کیا جاسکا ہے اس لئے یہ کتاب بھی رباعی کی ایجاد کے صحیح دور کا پتہ دینے سے قاصر ہے۔''(۱)

ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی نے رباعی کی ایجاد کے سنہ کی تحقیق کے سلسلے میں مولانا شبلی، عزیز لکھنوی وغیرہ کی آرا کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''ابھی تک سال ایجاد رباعی کا تعین نہیں ہوسکا ہے صرف اسی قدر مصدقہ ہے کہ دولت صفاریہ میں اس کا نام بجائے رباعی کے دوبیتی تھا مگر رباعی کے مقابلے میں دوبیتی کو شہرت نصیب نہیں ہوئی اور رباعی رباعی ہی مشہور ہوئی۔''(۲)

---

(۱-۲) جگت موہن لال رواں ص ۱۱۸ ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی نظامی پریس لکھنو ۱۹۸۴ء۔

اسی عہد میں پنڈت آنند نرائن ملا نے بھی نہایت گرانقدر اور فنی عظمتوں کے اعتبار سے خاصی رباعیاں کہیں ہیں انہوں نے اقبال اور انیس کی رباعیات کا انگریزی میں ترجمہ کر کے عالمی ادب کو رباعی سے متعارف کرایا۔ اپنی نظموں کی طرح ملا نے رباعیوں میں انسان کے درد و کرب اور ان کے۔ سائل کے بیان پر زیادہ ہی زور صرف کیا ہے۔ وہ زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کو فلسفیانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اس سے بحث کرتے ہیں ان کی آواز کی یہ گونج ملاحظہ کیجئے:

نازل ہوتی رہے گی یوں ہی یہ بلا
دنیا سے نہ جائے گی یہ جنگوں کی وبا
بزم انساں نہ ہوسکے گی ترتیب
جب تک بت قوم کی ہے گھر گھر پوجا

بت قوم کیا ہے دراصل یہی خود پرستی، انانیت، من وتو، اونچ نیچ، بھید بھاؤ، برتر و کمتر کے تصورات ہیں، جو تفریق بین الانسان کا موجب ہوتے ہیں اور جب تک انسان انسان ہی نہ بن سکا اس وقت تک سفا کی، عصبیت، بربریت، کشت وخون کی ہولی کھیلی جاتی رہے گی، زندگی اجیرن اور عذاب کی طرح اسباب گھٹن پیدا کرتی رہے گی۔ گذشتہ صدی میں دو جنگ عظیم سے انسان جوجھا، اور اب تیسری جنگ عظیم کا آسیب منڈلا رہا ہے ہر ساعت غیر متوقع ہے، اور جس دن انسان انسانیت کو پالے گا یہ دنیا ایک کنبہ بن جائے گی یہی آواز वसुन्धरा कुटुम्बकुम بن کر بھی گونجی۔ ملا کی یہ رباعی اسی تناظر کو پیش کرتی ہے:

یہ جذبۂ قومیت ہے اصلی رہزن
انسان کا یہی ہے آج جانی دشمن
امن دنیا کی بھولی سیتا کو کہیں
ہر نے لے فریب دے کر پھر یہ راون

ملا کے نزدیک مذہب کے نام پر دلوں میں بغض و کدورت کی آگ ہر ایک کو اپنے لپیٹ میں لئے ہے

حالانکہ اصل روح مذہب کی دلوں کو جوڑنا اور ملانا ہے جب تک انسان مذہب محبت کا پیرو نہ ہوگا امن عالم کا خیال خواب خرگوش ہی رہے گا اور اس زہر کا تریاق عراق میں بھی دستیاب نہیں ہے۔

تریاق بنے گا نہ کبھی زہر کا جھاگ
کڑوے بولوں کی گونج چھیڑے گی نہ راگ
تلوار کے پانی سے بجھے گی نہ کبھی
نفرت کی ہواؤں کی لگائی ہوئی آگ

اور اس رباعی میں ملا نے نہایت سچی بات کہہ کر ہمیں غور وفکر کی طرف متوجہ کیا ہے:

قطرے قطرے مل کے بحر زخار بنے
ذرے پاس آگے قد کو ہسار بنے
صدیاں گذریں بشر نہ لڑنے سے تھکا
ہر صلح میں جنگ نو کے ہتھیار بنے

ذیل کی رباعی میں ملا نے یہ اشارہ کیا ہے کہ انسان کے ساتھ وہ کیفیات ہمیشہ لگی رہتی ہیں امید یا شکست امید، ان کا خیال یہ ہے کہ جب انسان کسی حصول مقصد میں جس کیلئے وہ کوشاں تھا اکثر امید کا دامن اس کے ہاتھ سے جاتا رہتا ہے ملا کا استدلال یہ ہے کہ یہی وہ منزل ہے، جہاں سے وہ نئے عزم سے آگے بڑھنا اور درپیش مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ کرتا ہے تو کامرانیاں اس کا حصہ ہو جاتی ہیں

ہر دور کہن کی دور نو اک تجدید
کب تک انسان فریب راحت کا شکار
تقدیر بشر کے باب کب تک یہی دو
پہلے امید پھر شکست امید

پنڈت آنند نرائن ملا کی چند اور رباعیاں ملاحظہ کیجئے، جن سے ان کی فنی مہارت اور قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی حق بینی اور حق گوئی ثبوت بہم پہونچتا ہے۔

یہ نور ترا ہے یا کہ ہے جام حیات
یہ تیری کرن ہے یا ہے پیغام حیات
خورشید سے کہہ رہی ہے شبنم دم صبح
تو میری حیات ہے کہ انجام حیات

ملنا کتنا کوئی ملاقات نہیں
باتیں کیا کیا مگر کوئی بات نہیں
یاران جہاں کی دوستی کیا کہئے
ہونٹوں پہ گھٹا دلوں پہ برسات نہیں

اس سے بھی نہ مٹ سکے گی تاریکی غم
اس میں بھی تشدد کا وہی ہے دم خم
اس لال سویرے میں بھی دنیا کے لئے
لالی ہے سواسوا سویرا کم کم

شمعیں گل کر کہ خواب راحت تو نہیں
تاروں کو بجھا کے صبح عشرت تو نہیں
چڑھنے والے مینارۂ ہستی پر
پیروں تلے جہاں کی میت تو نہیں

یہ تیرہ وتار غم کی راتیں کب تک
خوابوں سے سجائے گا براتیں کب تک
گھر کی شمعوں سے اٹھ چراغاں کر لے
تاروں سے کیا کرے گا باتیں کب تک

طائر چپ گل اداس سہمی سی نسیم
چھائی ہوئی اک مہیب خاموشیٔ بیم

لپٹی جاتی ہیں پتیاں شاخوں سے
آنے والا ہے کوئی طوفان عظیم

یہ دیو سماج خون پیتا جائے
پی پی کے لہو دلوں کا جیتا جائے

انسان سے کہو مٹائے جشن فطرت
اور اس کیلئے کفن بھی سیتا جائے

ڈھلتی ہوئی عمر آنکھ اٹھاتی ہے جدھر
برچھی لگتی ہے جیسے اک سینہ پر

کیا کیا پچھلے پہر ستم ڈھاتی ہے
اک شام کی یاد اک خوف سحر

نظروں کو ملا کے مسکرادو تو کہوں
دل کو تھوڑا سا آسرا دو تو کہوں

ہونٹوں پہ پھنسی ہوئی کب سے اک بات
ماتھے سے شکن ذرا ہٹادو تو کہوں

ویران کشت حیات ہوتا ہی رہا
لیکن دلوں میں پیار بوتا ہی رہا

طوفان کی مہیب سیٹیوں کی لے میں
ساحل کے ترانوں کو سموتا ہی رہا

ساقی پھر غم کی ہیں سپاہیں تیار
لانا میری بھی ارغوانی تلوار

یہ حربہ عیش دے میرے ہاتھ میں جلد
اب غم کی مجال ہو تو روکے میرے

فن اور فنکار کے متعلق ملا کا کہنا ہے:

فن کی دیوی کو مسکراتے دیکھا
اک اور بلندی سے بلاتے دیکھا
پہونچا فنکار جب کسی چوٹی پر
زینہ اوپر کو اور جاتے دیکھا

حکومت کی لغت میں قانون کی تعریف میں لطیف طنز ملاحظہ کیجئے:

یہ حق کا تحفظ ہے نہ آئیں کا اجارا
مجرم کیلئے قہر نہ بیکس کا سہارا
قانون کی تعریف حکومت کی لغت میں
طاقت کے نشے میں کوئی بہکا سا اشارہ

اردو سے ملا کو والہانہ عشق ہے اس کی زبوں حالی اور کسمپرسی سے ملا افسردہ ہیں اس تناظر میں ملا کی شدت درد ملاحظہ کیجئے:

اک موت کا جشن بھی منالیں تو چلوں
پھر پونچھ کے اشک مسکرالیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگا کے مٹتی ہوئی اردو
اک آخری گیت اور گالیں تو چلیں

آنے والے کل کے حوالہ سے یہ رباعی دیکھئے، جس میں رجائیت کا پہلو نمایاں ہے:

میرے سر میں ابھی ملا یہ خلل باقی ہے
آج گمنام ہوں لیکن ابھی کل باقی ہے
نقش پا سے ابھی روشن نہ سہی راہ ادب
میری تابانی کردار و عمل باقی ہے

اردو کا یہ دردناک المیہ ملاحظہ کیجئے:

یہ سانحہ چھل ونو میں جو ہوا
ہندی کی چھری تھی اور اردو کا گلا
اردو کے رفیقوں میں جو مقتول ہوئے
ملا نامی سنا ہے شاعر بھی تھا

پنڈت آنند نرائن ملا کے چند متفرق قطعات، رباعیات، ثلاثی یا مثلث اور اشعار ملاحظہ کیجئے، سب سے پہلے ان کا دوستانہ مشورہ دیکھئے، جو دعوت مسکراہٹ زیر لب سے مملو اور ان کی تہہ داریوں کا اشارہ لائق صد غور و فکر ہے:

جناب ملا کروں میں کچھ عرض آپ اس کی جو دیں اجازت
کلام اپنا بہ لحن پڑھنے کی کیوں اٹھاتے ہیں آپ زحمت
گلے میں ہے آپ کے جو سرگرم کوئی نہیں ان سروں سے واقف
سمجھنے والا ہی جب نہیں ہے تو فن دکھانے کی کیا ضرورت

اک ہنسی تو وہ جو ہے اشکوں سے وقتی سا فرار
اک ہنسی ہے انتہائے غم میں آجانے کا نام
شعر ملا ہے اندھیروں میں اجالے کی تلاش
فکر ملا ہے ستارے توڑ کر لانے کا نام

ثلاثی - مثلث :- تین مصرعوں میں فطرت انساں کا یہ روپ دیکھئے:

سوئی سے چھد گیا پارے کا جگر بھی ملا
مگر اک مرد کی آوارہ نگاہی نہ گئی
اور عورت کے خیالوں کا بھٹکنا نہ گیا

ملا کے متفرق یا منفرد اشعار میں سب سے زیادہ شیطان کا غم ملاحظ کیجئے، جو حقیقت کے پیرائے میں ملا کی فنی اور فکری عظمتوں کے شاہد ہیں:

فردوس سے جس روز کئی کو نہ نکالا
جس روز جہنم میں کسی کو نہ ڈھکیلا

اپنے ہی غموں سے اسے فرصت نہ ملی جب
ہاں زیست میں شیطاں کے ایسے بھی ہیں کچھ روز

اکیلا غم کی سیہ شب میں خستہ پا انساں
ازل سے جنت گم گشتہ کی تلاش میں ہے

میں تجھ سے مل تو چکا ہوں ہزار بار مگر
سلگ رہی ہے ابھی دل میں انتظار کی آگ

آرزو پوری نہ ہوتی تو نہ ہوتی غم نہ تھا
غم تو ہے آرزو کا حوصلہ جاتا رہا

ارتقا کی داستاں اب تک تو انساں کیلئے
آنسوؤں کا ایک دریا ہے کہ بہتا جائے ہے

امن کی اس جنگ جو دنیا میں سنتا کون ہے
ہر پیام صلح صحرا کی اذان بنتا گیا

ہم اہل دل کا زاہد زیست میں بس ایک مسلک ہے
جہاں سر خود بخود جھک جائے اس کو آستاں سمجھو

بے ارادہ قہقہوں پر قہقہے دیوانہ وار
یوں بھی آتی ہے ہنسی جب دیر تک آتی نہیں

تجھ سے کیا اوبتا کبھی اے دوست
تجھ کو جی بھر کے پیار ہی نہ کیا

شاید وہ خود ہی چل نہ سکے زندگی کے ساتھ
جن کی زباں پہ ہے کہ زمانہ بدل گیا

زیست فنکار کی آلودہ ٔ دینا تو ہوئی
چشم فنکار کی معصوم نگاہی نہ گئی

بچ گئی دام سے ماہی تو نہیں خوش پھر بھی
اب اسے غم ہے کہ کیوں دام میں آ ہی نہ گئی

خون شہید سے بھی ہے قیمت میں کچھ سوا
فنکار کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند

اس نظر کا فریب کیا کہئے
ماں کی چھاتی سے شیر خوار ہٹے

تیری الفت کا گیا وار نہ خالی اے دل
وہ تغافل کی سپر لینے پر مجبور ہوا

پوچھو نہ سانحات زمانہ کی داستاں
اپنے چمن کو لوٹ لیا خود بہار نے

جو اپنی موت سے دنیا میں کچھ کمی نہ ہوئی
تو زیست مستحق نام زندگی نہ ہوئی

ہنستے تھے زمانے کو ہم درد سمجھ کر ہم
اب اپنے عقیدے پر ہنسنے کا زمانہ آیا

آج دنیا سے اٹھانا کام وہ ملا جسے
کامیاب زیست بن جانا کوئی مشکل نہ تھا

خلوص فن کا ہر فنکار سے پہلا تقاضا ہے
نظر ہراک کی جانب بھی ہو جب سوئے جہاں دیکھے

رخ صنم خانہ تمتمایا شکن جبیں حرم پہ آئی
ادھر جہاں کے الم کدے میں کسی نے راحت کا خواب دیکھا

تیری جفا کو بھی سمجھا نگاہ درپردہ
کہاں کہاں دل شیدا نے آسرا ڈھونڈا

ستم پر ستم کررہے ہیں وہ مجھ پر
مجھے شاید اپنا سمجھنے لگے ہیں

آشیاں والوں کی اب گلشن میں گنجائش نہیں
آج صحن باغ میں یا صید یا صیاد ہیں

دکھاسکے نہ ہرگز جہاں کوامن کی راہ
ستمگری کی وہ مشعل جو دور سے ہے سیاہ

انساں کی حالت کا ابھی ہے وہی معیار
ہے سب سے سوا پختہ دلیل آج بھی تلوار

حل کے بھی اندھے پتنگوں کو نہ کچھ عقل آئی
آج بھی شمع کی ہے گرمیٔ بازار وہی

کبھی موج دریا نے مڑکر نہ دیکھا
سفینہ لگا کون تھک کر کنارے

میں اب بھی منصب الفت کا اہل ہوں کہ نہیں
عدو کو میں نے ترا نام لے کے پیار کیا

حریف بن کے مقابل میں آ سکا نہ جہاں
تو دوست بن کے پس پشت آ کے وار کیا

مختصر یہ کہ ملا صاحب نے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے قطعات، رباعیات، غزل اور نظم میں گرانقدر اضافے بھی کئے اور موضوعات کے لحاظ سے ان سب میں یہی انسانی تڑپ خلوص ومحبت کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ ان کی تخلیقی شعور میں پختگی ہے، زبان اور بیان پر کامل قدرت رکھتے ہیں اس لئے اظہار خیال میں نہایت برجستگی ہے، نیز یہ کہ اپنے خیالات صفحہ قرطاس پر منتقل کرتے ہوئے چنداں تکلف نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ لکھنا یا کہنا چاہتے ہیں نہایت صاف گوئی سے برجستہ اور برمحل لفظوں میں ادا کر دیتے ہیں۔

باب ششم

# ملا کی شاعری کے بارے میں
# ممتاز ناقدین کا مطالعہ

پنڈت آنند نرائن ملا نے ہر اعتبار سے اپنے بارے میں دوستوں احبابوں کے توصیفی کلمات سننے کو کبھی پسند نہیں کیا بلکہ ان کے نزدیک کسی فنکار کے ادبی قامت کو جانچنے کیلئے معاصرین کی رائے کچھ زیادہ اہم نہیں ہوتی بلکہ خود مشک ہے خوشبو نہ کہ خوشبو کہے عطار، ان کے نزدیک ادب ہو یا زندگی دونوں چیزیں دور بہ دور پروان چڑھتی ہیں، ان میں ایک خاص قسم کا بہاؤ ہوتا ہے۔ ہر فنکار کا خواہ وہ کتنا ہی عظیم ہو اس کا مخصوص دائرہ کار ہوتا ہے، کسی کا بڑا اور وسیع تر اور کسی کا کند۔ ایک دور اپنے ختم ہوتے ہوتے اپنا ورثہ اگلے دور کے حوالے کر دیتا ہے یعنی اس نئے دور کا پچھلا دور پس منظر بن جاتا ہے اس پس منظر کے کینوس میں نئے دور کی شاعری پروان چڑھتی ہے دوسرے الفاظ میں اس کی وضاحت ریلے ریس کو سامنے رکھ کر کی جاسکتی ہے۔ ایک گروپ ایک رومال، گیند، نشان لیکر اگلے موڑ تک جاتا ہے اور وہاں اپنا اثاثہ گیند، رومال یا نشان دوسرے گروپ کے حوالے کر دیتا، اسی طرح دوسرا تیسرے کو اور تیسرا چوتھے کو۔

ملا کا یہ مفروضہ بڑی حد تک حقیقت پر مبنی ہے اس لئے اس سے منحرف نہیں ہوا جاسکتا پھر بھی ادبی روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ملا صاحب کے چند معاصرین اور مشاہیر ادب کی گرانقدر آراء کو نقل کیا جاتا ہے تاکہ ملا کے ادبی قدر و قامت کے تعین میں آسانی ہو سکے، اس لئے کہ:

”خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

اسی حدیث دیگراں کو اس موقع پر پیش کرنا ایک مبتدی کی حیثیت سے میں اپنا فرض بلکہ ادبی دیانت

سمجھتا ہوں سب سے پہلے جناب آل احمد سرور کی رائے دیکھئے:

''بعض اشعار میں وہ انفرادیت اور مخصوص تجربات کا ثبوت ضرور دیتے ہیں۔''(۱)

پروفیسر مجنوں گورکھپوری کی نگاہ میں:

''جذبات کا توازن زبان کی سنجیدگی و سلاست ان کی نمایاں خصوصیت ہے، ان میں صالح قسم کا ذوق تغزل پایا جاتا ہے۔''(۲)

پروفیسر سید احتشام حسین رقم طراز ہیں:

''ہلکے اور گہرے نفسیاتی اشارے، تشبیہوں اور استعاروں کی مدد سے غیر مرئی جذبات کی مصوری محبت کی دبی ہوئی چوٹوں کا ابھار معمولی تمثیلوں سے زندگی کے زبردست انقلابات کی جانب اشارے ملا کی غزلوں میں بے شمار پائے جاتے ہیں اور جو جز دان میں اثر کیفیت پیدا کرتی ہے وہ ان کا تجربہ اور خلوص ہے، جو حقیقت بنکر پھوٹ نکلتا ہے۔''(۳)

ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

''اردو شاعری میں ملا کی منفرد آواز ہے ان کی آواز ماضی کی صدائے بازگشت حال کا رزمیہ اور مستقبل کی نقیب ہے ملا صاحب کو جو چیز زندہ رکھے گی وہ یہ نہیں کہ ان کی ہمدردیاں کون سی سیاسی پارٹی کے ساتھ ہیں یا وہ ادب کی کون سی تحریک سے متاثر ہوئے، بلکہ یہ کہ انہوں نے زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں کیسے سوچا اور کس طرح اپنی شاعری میں اس سوچ کو سمویا۔ اس اعتبار سے ہمیں شاعر آنند نرائن ملا ایک منفرد اور توانا شخصیت نظر آتے ہیں۔''(۴)

پروفیسر جگناتھ آزاد اپنے تبصرہ میں لکھتے ہیں:

''ملا صاحب کی شاعری قدامت، جدت یا ترقی پسندی کے خانوں میں بٹی ہوئی شاعری نہیں ہے

---

(۱-۲) ماہنامہ نگار نیاز فتح پوری جنوری ۱۹۴۳ء۔

(۳) آج کل مارچ ۱۹۴۷ء

(۴) پیش لفظ جادہ ملا محررہ خلیق انجم انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی ۱۹۸۸ء۔

بلکہ فکر و نظر کا ایک تسلسل دور بینی انکشاف ذات کا عمل اور آفاقیت اس کی خصوصیات ہیں۔'' (۱)

سراج لکھنوی تحریر کرتے ہیں:

''میر تقی میر خواجہ میر درد، غالب، اقبال، جگر اور ملا کے کلام کو میں نے پسند کیا اور یہی سبب ہے کہ فکر و نظم کی رسہ کشی نے مجھے صرف زبان و محاورہ کے ہاتھوں بیچ ہونے سے بچالیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ملا کے کلام نے مجھے ترغیب کی کہ اقبال کو اچھی طرح سمجھا اور پڑھا جائے چنانچہ ۱۹۵۰ء میں اقبال کو میں نے اقبال کی حیثیت سے دیکھا اور پرکھا اس وقت معلوم ہوا کہ بقول اقبال۔ ع

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

اپنے عزیز دوست اور ہم عصر پنڈت آنند نرائن ملا کے یہاں مجھے اپنے ذوق کی ہم آہنگی نظر آئی۔'' (۲)

علی جواد زیدی رقم طراز ہیں:

''غزل کو جن لوگوں نے انفرادی لہجہ دیا ان میں ملا کا خاص مقام ہے، وہ ہمارے بلند قامت غزل گو ہیں نرمی اور گھلاوٹ صرف زبان و بیان ہی میں نہیں بلکہ سوچنے کے انداز میں بھی نمایاں ہے ملا چونکا دینے والا آہنگ اختیار کئے بغیر سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کو بات کہنے اور اپنے مافی الضمیر کو پورے خلوص اور صفائی ذہن کے ساتھ دوسروں تک اس طرح پہونچانے کا ڈھنگ آتا ہے کہ سننے والا ہمدردانہ غور و فکر کرنے پر آمادہ ہو جائے اس سے زیادہ ہم شاعر سے مطالبہ بھی کیا کر سکتے ہیں۔'' (۳)

ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب کا تجزیہ ہے:

''اقبال کی طرح وہ بھی معمولی باتوں کے عام منظر کو اس طرح غور سے دیکھتے ہیں کہ فلسفہ اور فکری عناصر پوری نظم کو وقیع بنا دیتے ہیں ملا کی زبان بڑی رچی ہوئی زبان ہے، فارسی محاورات اور تراکیب نہایت خوبی کے ساتھ برمحل استعمال کر کے لب و لہجہ کو بڑی بلندی عطا کر دیتے ہیں۔'' (۴)

---

(۱) ہماری زبان سیاہی کی ایک بوند پر تبصرہ محررہ پنڈت جگناتھ آزاد ۲۲ رمئی ۱۹۷۵ء (۲) شعبہ آواز دسمبر ۱۹۶۰ء نظامی پریس، لکھنؤ۔

(۳) پیش لفظ سیاہی کی ایک بوند ص ۱۵ علی جواد زیدی نامی پریس، لکھنؤ ۲۶ رمارچ ۱۹۷۳ء۔

(۴) مختصر تاریخ ادب اردو ڈاکٹر سید اعجاز حسین سرفراز قومی پریس، لکھنؤ ۱۹۶۵ء۔

ڈاکٹر دین محمد تاثیر لکھتے ہیں:

''ملا کے تغزل میں ذہانت کا عنصر غالب ہے، اور اسی لئے ان کا انداز بیان ہم کو انوکھا سا نظر آتا ہے، وہ سامنے کے مضامین کو بھی نئے انداز سے ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن اس میں ہلکی سی خشونت بھی پائی جاتی ہے اور تھوڑا سا Patronizing effect بھی اسی لئے نرمی وحلاوت جو غزل کی جان ہے ان کے یہاں کم ہے۔''(۱)

پروفیسر کلیم الدین اردو کے بلند پایہ اور ممتاز ناقدوں کی صف میں شامل ہیں، ملا کی بعض فنی کمزوریوں کے باوجود ملا کے انداز بیان اور انفرادیت کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''زبان میں نرمی اور ملائمیت زیادہ ہے، اور اس کے ساتھ زور بیان شوخی وصفائی بھی موجود ہے، مضامین اور مضامین کی ترجمانی میں ابتذال اور فرسودگی سے پرہیز ہے، لیکن جدت اور باریکی کا نام ونشان نہیں، خیالات وہی ہیں، جو اردو غزل میں عام طور سے نظر آتے ہیں اسلوب بیان میں انفرادی شان پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔''(۲)

ملا کی نظموں کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن رقم طراز ہیں:

''آنند نرائن ملا کی نظمیں گھن گرج سے آشنا ہیں وہ بڑی سے بڑی بات کہنے کے عادی ہیں اسی لئے ان کی نظموں میں فنکاری اور خیال دونوں کا لب ولہجہ مدھم ہے ان کی نظموں میں ربط وتسلسل کا احساس ملتا ہے اور بھرتی کے مصرعے کم۔''(۳)

صالحہ عابد حسین ملا کی اردو کی گرانقدر خدمات سے متعلق کہتی ہیں:

''ملا پچاس سال سے زیادہ نہ صرف سیاہی کی بوندوں سے اردو ادب کو مالا مال کر رہے ہیں بلکہ اردو کی حمایت اردو کی ترقی اس کی بقا کے لئے جدوجہد کرتے رہتے ہیں وہ اردو کو ماں کی طرح مقدس جانتے ہیں ..................جس زبان کے عاشق آنند نرائن ملا ہوں جو مسلمان نہیں ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ میں اپنا

---

(۱) نگار جنوری ۱۹۴۲ء ص ۱۴۔ (۲) نگار لکھنؤ جنوری ۱۹۴۲ء۔

(۳) اتر پردیش میں اردو نظم آزادی کے بعد ڈاکٹر محمد حسن۔

مذہب چھوڑ سکتا ہوں مگر زبان نہیں وہ زبان کیسے مرے گی۔‘‘(۱)

مندرجہ بالا اقتباسات میں پنڈت آنند نرائن ملا سے متعلق وہ ساری باتیں کہی گئی ہیں، جن کی تفصیل کیلئے سیکڑوں اوراق درکار ہوں گے موجودہ دور کی غزل گوئی کو حکایت کاکل ورخسار اور فسانہ ہجر ووصال کی تکرار سے نجات دلانے والوں میں ملا بھی صف اول میں ہیں ان کے اشعار میں ندرت فکر بالخصوص تجربات ومشاہدات کا خلوص صالح قسم کا تغزل اسلوب بیان میں انفرادی شان زبان میں تراش خراش اور نرمی و ملائمیت شوخی وصفائی ہندی الفاظ ہندی الفاظ فارسی محاورات وتراکیب کا برمحل استعمال بدرجہ اتم موجود ہے ملا کے معاصرین نے انہیں قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور شاعری میں ان کے استادانہ مقام کو تسلیم کیا ہے۔

وادیٔ شعر میں یہ جادۂ ملا ہی نہ ہو
اک الگ ہٹ کے نشان کف پا ہے تو سہی

(۱) کتاب نما دہلی آنند نرائن ملا صالحہ عابد حسین۔

# حرف آخر

مختلف عنوانات کے تحت ملا کی حیات ان کی شخصیت اور فن کی تصویر خاطر خواہ طور پر سامنے آنے کے علاوہ ان کی سیاسی سماجی سرگرمیاں اور ایک ماہر قانون اور بعد میں ایک ذمہ دار جج کے فرائض کی ادائیگی کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، کسی وکیل یا جج کی مصروف زندگی میں شعر وسخن کی لطافتوں کو بہت ہی کم دخل مل پاتا ہے پھر بھی اپنی تمام تر مشغولیت کے باوصف انہوں نے شعر وادب اردو کی خدمت انجام دیتے ہوئی اپنی نظم ونثر کی دس کتابیں منظر عام پر لاکر اپنے نام اور فن کو اردو ادب کی تاریخ کا ایک مستقل باب بنادیا ہے۔ ملا کے معاصرین اور مشاہیر ادب کے تاثرات ان کے نظریہ شاعری ان کی غزل گوئی نظم نگاری رباعی اور قطعات مختلف مضامین دیباچے قطعات کی ایک بے لاگ تصویر پیش کی گئی ہے۔

ایک بلند پایہ وکیل کی ساری زندگی موکل، عدالت کے مصروف ترین ماحول اور کچہری کی نت نئی الجھنوں میں بسر ہوتی ہے پھر بھی ملا نے شعر وادب کی خدمت کیلئے معدودے چند حضرات مثلاً ڈاکٹر اقبال، برج نرائن چکبست، جگت موہن لال رواں کی طرح وقت بچا کر جو کارنامے انجام دئے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ پنڈت آنند نرائن ملا پیشے کے اعتبار سے اپنے زمانے کے ہندوستان کے نامور وکیلوں میں شمار کئے جاتے تھے، الہ آباد ہائی کورٹ میں بحثیت ایک ذمہ دار مصنف کے سات سال تک اپنی کرسی عدالت سے جو تاریخ ساز فیصلے انہوں نے صادر کئے وہ عدلیہ کی تاریخ بن چکے ہیں اس کے علاوہ انہوں نے سیاسی وسماجی طور پر وطن عزیز کی جو خدمت کی اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بایں

ہمہ اپنے فطری ذوق کی تکمیل بھی کی، نیز اردو ادب کی نہایت گراں خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے شاعری کی ابتدا انگریزی شاعری سے کی اور بے پناہ شعری صلاحیتوں سے اردو کے سرمایہ میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ ان کے بزرگ پنڈت منوہر لال زتشی نے ان کی فطری صلاحیتوں کو دیکھ کر ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ کیا اور انہیں شعر گوئی کی طرف مائل کیا۔ ملا کے اندر شعروسخن کی دبی ہوئی چنگاری رفتہ رفتہ بھڑک کر ایسے شعلہ جوالہ کا روپ اختیار کر گئی کہ انہوں نے تقریباً ۵ ہزار اردو اشعار لکھ کر اردو شاعری کے سرمایہ میں ایک لائق قدر اضافہ کیا۔ ملا کی نثری خدمات اس کے علاوہ ہیں، جن کا مفصل جائزہ پچھلے ابواب میں پیش کیا جا چکا ہے۔

ابتدائے بیسویں صدی عیسوی (۱۹۰۱ء) میں ملا کی ولادت ہوئی تھی۔ یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں نہایت نازک اور کٹھن دور تھا، مختلف قسم کی تحریکیں، آزادی کی تحریک، علیگڑھ تحریک، مسلم لیگ، برہمو سماج، عدم اعتماد تحریک، ترقی پسند تحریک، کانگریس وغیرہ غرضکہ نئی نئی تحریکیں مجموعی طور سے سماجی، معاشرتی، معاشی ذہنی خلفشار و بے چینی پیدا کئے ہوئے تھیں۔ ایسے ماحول میں ملا کی شاعری کا زمانہ بھی پرسکون نہ تھا پھر بھی انہوں نے اردو کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی شعر گوئی کا آغاز جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے انہوں نے اپنی پہلی نظم پرستار حسن سے کیا تھا۔ ان کی نظموں کے موضوعات انسانی زندگی کے تجربات ومشاہدات، سماجی کوائف، نظام کائنات اور حیات انسانی کے افکار ومسائل سے عبارت ہیں۔ ملا ایسے برعافیت معاشرتی نظام کے خواہاں تھے، جہاں عزت نفس کے ساتھ پرسکون زندگی گذاری جا سکے۔ اپنی کتاب ''کچھ نثر میں بھی'' میں انہوں نے اس جانب اشارہ کیا ہے، جس سے ان کے عافیت کوشش ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔ انسان کے جسم کو کسی چیز کے شکار بننے کا اندیشہ نہ ہو اور اس کے ذہن کو غلام بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اسے امن ومحبت کی کھلی اور بے خوف فضا میں سانس لیکر اپنے انسانی قد تک پہونچنے کا موقع ملے۔ یہی بنیادی افکار وتصورات ان کی نظموں کے موضوع ہیں۔ اس سلسلے میں تفصیلات سے سمجھنے کیلئے ان کی نظمیں گمراہ مسافر، انسان، گنہگار، جہاں میں ہوں، انسانی درندے، انسان کو ملاؤ انسان سے، اور ایک دن انسان

جئے گا، اور بڈھا لائق ذکر ہیں۔ ملا نے بیسویں صدی کے انسان کی زندگی اور اس کے مختلف اتار چڑھاؤ ترقی وتنزلی، فکر وسکون کو بخوبی پرکھا اور اس کا مطالعہ کیا ہے اسی لئے ان کا شعور واحساس جدید عہد کے احساسات کی مکمل شبیہ بن گیا ہے۔

اس کے علاوہ ملا نے ہندوستان کے لائق ستائش فرزندوں مثلاً موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، رابندر ناتھ ٹیگور، سروجنی نائیڈو، بوئے گم شدہ (ڈاکٹر ذاکر حسین خلاں صدر جمہوریہ ہند کی وفات سے متعلق) شہید امن (لال بہادر شاستری وزیر اعظم ہند) اور خاص کر مہاتما گاندھی کا قتل، مہاتما گاندھی کا خیر مقدم جیسی لائق قدر شخصیات پر نظمیں لکھ کر انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے، یہ بات لائق یاد رکھنے کے ہے کہ تاثراتی نوع کی شاعری اس وقت تک پر اثر نہیں ہوسکتی، جب تک شاعر خود نجی طور پر اس سے متاثر نہ ہو۔ ان نظموں کے مطالعہ سے اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ ملا صاحب ان مذکورہ شخصیات سے مجموعی طور پر اور خصوصی طور پر مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو سے کتنی گہری عقیدت اور قلبی وروحی وابستگی رکھتے تھے، چکبست اور سرور کی طرح پنڈت آنند نرائن ملا بھی مادر ہند سے دلی لگاؤ اور محبت رکھتے تھے۔ غلامی کے زمانے میں بھی انہوں نے اقبال کی طرح ہندوستان کی عظمتوں کے گن گان کئے اور آزادی کے بعد اس کی عظمت کے ترانے گائے۔ ان کی نظمیں ہندوستان دوستی کے جذبات سے عبارت ہیں۔ نظموں کے ساتھ ساتھ قطعات ورباعیات میں بھی ملا کی انفرادیت اور ان کی امتیازی اہمیت نمایاں ہے، جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ ملا نے اپنی شاعری کا آغاز نظم سے کیا تھا۔ لیکن نظموں کے علاوہ انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے، اور ساتھ ہی بڑی نازک صنف سخن ہے ملا نے اپنے خیالات وفکر شعور، داخلی وخارجی محسوسات، معاشرتی اور سماجی شعور کو غزل میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ انہوں نے جدید عصری زندگی کے تقاضوں سے روشناس کرایا اور اسکی روایات کا ادراک حاصل کیا اور خوب خوب جائزہ لیا اور پھر اپنے تجربات کی آگ دے کر اپنی غزلوں کو کندن بنا دیا۔ موضوعات میں تنوع فکر وخیال میں ندرت پیدا کی مجموعی طور پر ان کی شاعری ایک دردمند دل کی شاعری ہے، اسی لئے ان کے اشعار دل میں کھپتے چلے جاتے

ہیں۔ ''از دل افتد بر دل ریزد'' اگر یہ کہا جائے کہ امیر مینائی کے اس مصرعے (سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے) کے بموجب ملا کا دل بھی سارے جہاں کے درد کو اپنے اندر بسائے ہوئے تھا تو شاید غلط نہ ہوگا۔ اس میں شک وشبہ کا شائبہ نہیں کہ انسانیت کو ایک مسلک کی طرح غالب، حالی، یاس وغیرہ کے بعد برتنے والوں میں ملا کا نام بھی نمایاں مقام کا حامل ہے۔ ملا نے غزل کے مستقبل کو اپنی فکری کاوشوں سے تابنا کی عطا کی اور اسے کارآمد صنف سخن بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی غزلوں میں اپنے وطن سے عشق انسان اور انسانیت کی قدروں کا احترام نظر آتا ہے، ان کے اشعار کے الفاظ اپنی اپنی جگہ نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں اور اپنی معنویت اور اہمیت کا ادارک بہم پہونچاتے ہیں۔ ملا نے اس کے علاوہ اپنے کلام میں کچھ الفاظ کو نئی روشنی اور جہت بھی وہی ہے اور اپنے لفظیات کو نئے معنوں نے آراستہ وپیراستہ کیا ہے۔ ان کی غزلیں اپنے مخصوص لب ولہجہ اور نئے جہات فکر اور نئی سمت ورفتار کی وجہ سے اردو غزل کی مخصوص منزل کی رہنمائی کرتی ہیں، جس کے بارے میں حالی نے کبھی سوچا تھا۔

یہ امر تعجب خیز ہے کہ ملا نے لکھنؤ کے ماحول میں رہ کر نیز انجمن بہار ادب سے وابستگی کے باوجود لکھنؤ کی معاملہ بندی کی شاعری فرسودہ خیالات اور مختصر یہ کہ پامال شاعری کی متعفن فضا اور اس کے تباہ کن اثرات سے خود کو پوری طرح محفوظ رکھا۔ دراصل یہ بچاؤ اور دامن سمیٹے رہنا خود ملا کے شاعرانہ رکھ رکھاؤ ان کی وسیع الذہنی اور انفرادیت پر دلالت کرتا ہے۔ بقول شاعر:

''بگیر رسم تعلق دلا ز مرغابی کہ در آب شود و چوں برخاست خشک پر برخواست''

ملا بھی پانی میں رہ کر بھی دامن تر کئے بغیر باہر نکل آئے ورنہ ان کے روبرو وہی منزل تھی کہ:

اندرون قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

ملا کا کمال یہی ہے کہ انہوں نے ان مسموم فضاؤں سے خود کو پوری طرح سے پاک ومنزہ رکھا۔ ان کا یہی وصف ان کی پاک اور صحت مند شاعری کی وجہ اور دلیل ہے۔ (الاناء یترشح بما فیہ) برتن سے

وہی ٹپکتا ہے جو اس میں ہوتا ہے۔

جہاں تک ملا کے نثری کارناموں کا تعلق ہے ملا صاحب نے سیکڑوں مضامین لکھے (یہ بات مصدقہ ہے) لیکن بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر دست بردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ کر سب تلف ہو گئے ان کا کوئی سراغ دستیاب نہیں ہے۔ پھر بھی چند متفرق اور مختصر مضامین کچھ رسالوں میں محفوظ ہو گئے ہیں، جو مشتے از نمونہ خروارے ان کی تخلیق ذہنیت اور نام پر ان کی مضبوط گرفت پر دلالت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی مشہور نثری تخلیق کچھ نثر میں بھی میں مختلف موضوعات پر بیس مضامین ہیں، خاص طور سے دیباچے، اور خطبات اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ اس کتاب کے علاوہ یادِ چکبست اور جواہر لال نہرو کی انگریزی تقاریر کے ترجمے موسوم بہ مضامین نہرو دونوں حوالہ کی کتابوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یقین ہے کہ ان کی ادبی حیثیت ہمیشہ قائم رہے گی۔

ملا کا نثری اسلوب نہایت ستھرا صاف اور شگفتہ ہے، وہ اپنی بات نہایت سوچ سمجھ کر سلیقے سے کہنے کے عادی ہیں چھوٹے چھوٹے جملوں میں ستھری اور عام فہم زبان میں بات کرنا ان کا خاص وصف ہے جو ان کی شخصیت کی سادگی پر دلالت کرتا ہے۔ نیز یہ کہ یہ بھی اشارہ ملتا ہے ان کے ذہن میں کسی طرح کی ژولیدگی نہیں ہے ان کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ ان کے سارے موضوعات میں ان کے خیالات کی پاکیزگی کے واضح نقوش نظر آتے ہیں ان کے جملوں میں ایک توازن اور وقار ہوتا ہے، جو غالباً ان کے جج ہونے کی وجہ سے ہو۔

میری حدیث عمر گریزاں کے دیباچہ میں انہوں نے ادب عالیہ، فن اور فنکار، داخلیت اور خارجیت حقیقت نگاری غزل اور عشقیہ شاعری جیسے نکات پر پورے ثبوت، دلائل سے جو بحث پیش کی ہے وہ نہایت بصیرت افروز اور ادبی اہمیت کی حامل ہے۔ اس طرح ان کے دوسرے مضامین میں ان کا حکیمانہ شعور، مدلل انداز بیان، خطبات اور دیباچے ان کے باصلاحیت فنکار اور نقاد ہونے کا ثبوت بہم پہونچاتے ہیں۔ ملا صاحب نے عروسِ سخن کی مشاطگی ستائش کی تمنا کئے بغیر اور صلے سے بے پرواہ ہو کر کی ہے پھر بھی جس

انہاک اور ذوق ولگن سے انہوں نے زبان وادب کی خدمت کی ہے۔ اس کی نظیر نظر نہیں آتی ہے۔ ملا صاحب بھی ناقدوں اور نثر نگاروں میں اکثر وہ مقام نہ پا سکے جس کے وہ اہل تھے بلکہ نظر انداز کئے گئے لیکن پھر بھی قدر ہیرا شاہ داند کے مصداق ان کے ہم عصروں اور مشاہیر ادب نے ان کو صحیح طور پر پہچانا نقادوں اور ادیبوں نے توصیفی کلمات قلمبند کئے، جو ان کی شاعرانہ عظمتوں پر دلالت کرتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ ''بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا''

زبان وبیان اور طرز ادا کے لحاظ سے ملا کی شاعری میں پختگی شگفتگی اور ماہرانہ بو ہے، انہیں زبان پر مکمل دسترس حاصل ہے۔ ان کی نثر ہو یا شاعری ادق اور نامانوس اور ثقیل الفاظ سے پاک ہوتی ہے مضامین گنجلک یا پیچیدہ نہیں ہوتے، جس طرح لکھنوی زبان اپنا ایک منفرد وصف اور اسلوب رکھتی ہے اس طرح ملا صاحب کی زبان بھی اپنی ندرت اسلوب اور طرز بیان کی سادگی میں معراج کمال پر فائز نظر آتی ہے۔ مشاہیر اہل قلم کے مطابق چکبست کے بعد ملا ہی لکھنوی ادب کی معزز ترین ہستی ہیں۔ ملا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو کے علاوہ بعض دوسری زبانوں سے بھی کسب فیض کیا۔ انگریزی ادب پر خاصا عبور رکھنے کے علاوہ فارسی الفاظ، تراکیب، تشبیہات کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں ہندی کے عام فہم اور سہل الادا الفاظ کا برمحل استعمال کیا ہے بطور تمثیل نظم شعر کا جنم اندھیر نگری میں دیپ جلیں اور سپنے بطور نمونہ پیش کی جاسکتی ہیں۔ ملا اردو شاعری کے یقیناً مزاج داں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا کلاسیکی ادب کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ نیز یہ کہ محتاط رویہ اپناتے ہوئے زبان وبیان پر خاص دھیان دیتے ہیں ان اشعار میں بلند خیالات دلکش بیان، متانت اور شعریت بدرجہ اتم ہوتی ہے، اپنے فن کے بارے میں ملا کا خود قول ہے کہ:

اظہار درد دل کا تھا اک نام شاعری
یاران بے خبر نے اسے فن بنادیا

دراصل فنکار کی فکری اور فنی کامیابی اور اثر انگیزی کا راز ہی یہ ہے کہ اس کے احساسات وجذبات

میں خلوص اور صداقت ہو ورنہ اس کا تمام حسن بیکار ہو جائے گا۔ ملا صاحب ایک شاعر کا دل رکھتے ہیں اور ان کا ذہن فنکار کا ذہن ہے درد انسانیت ان کے اندر روح بن کر دخیل ہے، یہی وصف انہیں دوسروں کے مقابلے میں امتیاز عطا کرتی ہے ان کے مسلک کے بارے میں خود ملا سے سنئے:

ملا اپنا مسلک فن ہے کہ رنگ فکر
کچھ دیں فضائے دہر سے کچھ لیں فضا سے ہم

اگر یہ کہا جائے کہ چکبست کی شاعری میں بیسویں صدی کے آغاز کے بیس سال کی سیاسی سماجی زندگی کی عکاسی ملتی ہے تو راقمہ کو یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ ملا کی شاعری میں پورے عہد کی عکاسی ملتی ہے اور یہ سچ بھی ہے کہ اچھے فنکار کے اندر اس کا عہد سانس لیتا ہے اور اس کی صدی بولتی ہے۔ ملا نے اپنی شاعری میں کہاں تک روح عصر کو سمویا ہے اس کا فیصلہ ارباب اہل نظر ہی کر سکتے ہیں۔ پھر بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ملا صاحب کا اردو غزل نظم اور رباعی کو نیا رنگ و آہنگ عطا کرنے میں ان کی فکر اور لب ولہجہ کو بھی بڑا دخل ہے اور وہ آسانی سے پہچانے بھی جا سکتے ہیں۔ ان کے اشعار اپنے مخصوص انداز نظر اور طرز احساس کی وجہ سے مخصوص غزل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ انہوں نے انسانی عظمتوں کے گن گائے ہیں انہیں غالب، یگانہ، حالی کی طرح ایک نئے جادہ کی تلاش ہے:

فضا کی تیرگی شب سے کر نہ قیاس
افق کی گود میں ننھا سا آفتاب بھی دیکھ

یہی نہیں وہ اس منزل سے بھی آگے گذر جانے کی بات بھی کرتے ہیں:

وہ پیش نظر ہے وادی گل ہمت سے ذرا اک اور قدم
اب کوہ کو تو سر کر ہی چکا تھوڑی سی ترائی باقی ہے

ملا کے آخری دور کی شاعری اسی فکری آفاقیت میں بدل جاتی ہے۔ گذشتہ صدی کے اردو کے ایک عہد آفریں شاعر اور اس کے مجاہد کی حیثیت سے پنڈت آنند نرائن ملا کا نام کبھی فراموش نہیں کیا جائیگا۔ ان

کی شاعری قدیم وجدید رنگوں کی قوس وقزح کی طرح درخشاں ہے۔ ان کا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے، صلح کل اور انسان دوستی ان کا مسلک ہے، اور محبت ان کا دین دھرم، وہ انسانیت کوکل کی حیثیت سے دیکھتے اور اس کا احترام کرتے ہیں وہ تمام انسانیت اور تمام انسانوں کو مجرد شکل میں دیکھنے کے خوگر ہیں۔ معاشرت اور اجتماعیت کی اونچ نیچ اور عدم مساوات سے پرے رکھنے کے قابل ہیں۔

مختصر یہ کہ ملا کی شاعری بلند خیالات، پاکیزہ جذبات اور دل نشین تغزل کا سرمایہ اور مشرب انسانیت کی آئینہ داری کرتی ہے، ان کی قومی اور شخصی نظمیں لائق قدر سرمایہ ادب ہیں، وہ اردو کے بےلوث خادم اور مجاہد ہیں، اور اسی ذمہ داری کو نبھانے کیلئے وہ مختلف اہم اردو انجمنوں، اکیڈمیوں کے ممتاز اور کلیدی عہدوں پر فائز رہے۔ وہ مختلف مناصب اور فراست کی وجہ سے نسبتاً ایک منفرد شخصیت کے مالک ہیں۔

میرے سر میں ابھی ملا یہ خلل باقی ہے
آج گمنام ہوں لیکن ابھی کل باقی ہے
نقش پا سے ابھی روشن نہ سہی راہ ادب
میری تابانی کردار وعمل باقی ہے

# کتابیات

۱- بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں مرزا جعفر حسین اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۷۹ء

۲- حالی بحیثیت شاعر ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

۳- نئے اور پرانے چراغ پروفیسر آل احمد سرور سرفراز قومی پریس لکھنؤ، ۱۹۶۳ء

۴- حرف ناتمام عمر انصاری نامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۸ء

۵- رومانی تحریک پروفیسر محمود الٰہی ضمیمہ قومی آواز لکھنؤ ۴ر دسمبر ۱۹۸۸ء

۶- جادہ ملا ڈاکٹر خلیق انجم انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۸۸ء

۷- میری حدیث عمر گریزاں آنند نرائن ملا انڈین پریس پرائیوٹ لمیٹیڈ الہ آباد دسمبر ۱۹۶۳ء

۸- کرب آگہی گوپی چند نارنگ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی جنوری ۱۹۷۷ء

۹- جوئے شیر آل احمد سرور نامی پریس لکھنؤ ۱۹۴۹ء

۱۰- جدید شاعری ڈاکٹر عبادت بریلوی

۱۱- ماہنامہ نگار نیاز فتحپوری جنوری ۱۹۴۲ء

۱۲- آج کل دہلی مارچ ۱۹۴۷ء

۱۳- ہماری زبان تبصرہ پنڈت جگناتھ آزاد ۲۲ر مئی ۱۹۷۵ء

۱۴- شعلہ آواز دسمبر ۱۹۶۰ انظامی پریس لکھنؤ

۱۵- سیاہی کی ایک بوند علی جواد زیدی نامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۳ء

۱۶- مختصر تاریخ ادب اردو ڈاکٹر سید اعجاز حسین سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۶۵ء

۱۷-اتر پردیش میں اردو نظم آزادی کے بعد ڈاکٹر محمد حسن

۱۸-کتاب نما دہلی آنند نرائن ملا صالحہ عابد حسین

۱۹-جگت موہن لال رواں اناوی حیات اور ادبی خدمات ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۴ء

۲۰-انتخاب کلام جوش احتشام حسین مسیح الزماں کتاب محل الہ آباد

۲۱-اثر کے تنقیدی مضامین-جعفر علی خاں اثر لکھنوی

۲۲-تاریخ اقوام کشمیر محمد الدین فوق گلشن پبلشرز گاوکدل سری نگر کشمیر ۱۹۸۸ء

۲۳-رسالہ فروغ اردو لکھنؤ فروری ۱۹۷۴ء آنند نرائن ملا سے انٹرویو احتشام حسین۔

۲۴-رسالہ نگار جنوری، فروری ۱۹۴۱ء آنند نرائن ملا کی زبانی

۲۵-دور جدید کے چند منتخب ہندو شعراء عبدالشکور دانش محل لکھنؤ ۱۹۴۳ء

۲۶-رسالہ ہمائے دہلی انٹرویو خالد ہندی جولائی ۱۹۶۹ء

۲۷-شیش محل شوکت تھانوی خواجہ برقی پریس دہلی پہلا ایڈیشن

۲۸-آپ سے ملئے علی جواد زیدی مرتبہ عرفان عباسی لکھنؤ

۲۹-اوراق گل ضمیر احمد ہاشمی ایم آر خاں رام پور اسٹیٹ ۱۹۴۴ء

۳۰-مقدمہ شعر و شاعری الطاف حسین حالی یوپی اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۸۲ء

۳۱-کچھ ذرے کچھ تارے آنند نرائن ملا انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۹ء

۳۲-ادبی تنقید ڈاکٹر محمد حسن

۳۳-جوئے شیر آنند نرائن ملا مقدمہ آل احمد سرور نامی پریس لکھنؤ ۱۹۴۹ء

۳۴-رسالہ ہماری زبان مئی ۱۹۷۵

۳۵-یاد چکبست آنند نرائن ملا انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۹ء

۳۶-تنقیدی اشارے آل احمد سرور سرفراز قومی پرس لکھنؤ

۳۷- ہماری زبان دہلی فروری ۱۹۷۶ء

۳۸- کربِ آگہی آنند نرائن ملا مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی ۱۹۷۷ء

۳۹- روشنائی سجاد ظہیر محبوب المطابع برقی پریس دہلی ۱۹۵۹ء

۴۰- رسالہ گنگ و جمن کانپور سجاد ظہیر نمبر

۴۱- رسالہ یوجنا مارچ ۱۹۸۷ء ارتضیٰ کریم

۴۲-- رسالہ' بلند اردو ہفتہ وار ۲۸ نومبر ۱۹۸۷ء ڈاکٹر محمد حسن مضمون نگار

۴۳- ماہنامہ نگار اصاف سخن نمبر مضمون اردو شاعری کا تاریخی اور فنی ارتقاء احتشام حسین ۱۹۵۷ء

۴۴- نقوش و افکار مضمون نظیر اکبرآبادی اردو شاعری میں واقعیت اور جمہوریت کا ظہور از مجنوں گورکھپوری

۴۵- اردوئے معلیٰ اپریل ۱۹۴۰ء

۴۶- ناروا فرقت کاکوروی

۴۷- اردو انسائیکلو پیڈیا ڈاکٹر عبدالوحد فیروز سنٹر لمٹیڈ لاہور ۱۹۶۲ء

۴۸- آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب ڈاکٹر محمد ذاکر مکتبہ جامعہ لمٹیڈ دہلی ۱۹۸۱ء

۴۹- اردو کی عشقیہ شاعری فراق گورکھپوری

۵۰- اردو رباعیات ڈاکٹر سلام سندیلوی، نسیم بکڈپو، لکھنؤ۔

۵۱- کعبہ میں صنم خانہ ڈاکٹر سلام سندیلوی، نسیم بکڈپو، لکھنؤ فروری ۱۹۶۶ء۔

۵۲- شعر العجم جلد اول شبلی نعمانی، دار المصنفین اعظم گڑھ۔